۱۴
درس

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

مسلمانوں کی سیاسی وملّی زندگی کے رہنما اُصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اس کتابچے کی اشاعت وطباعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے

نام کتابچہ ـــــــ مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے رہنما اصول (درس 14)
طبع اوّل (اپریل 2001ء) ـــــــ 2200
طبع دوم (اپریل 2005ء) ـــــــ 2,200
ناشر ـــــــ ناظم نشر واشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت ـــــــ 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 03-5869501
مطبع ـــــــ شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت ـــــــ 24 روپے

درس ۱۴

مسلمانوں کی سیاسی وملّی زندگی

کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۃ الحجرات مکمل ہے۔ یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستورِ اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرضِ تفہیم تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے۔

پہلا حصہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے 'اصل الاصول' یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی [1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملّت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست 'مادر پدر آزاد'

---

[1] کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے　　یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے 'پابند' ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جا سکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی کی 'اصلِ ثانی' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ) اور پھر اُس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (ع 'ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر!)

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیۃ کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرزِ جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا۔۔۔ اس کے بالمقابل اصلِ ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملتِ اسلامیہ کے پاس وہ 'مرکزی شخصیت' موجود ہے جس سے تمدنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بہ تمام و کمال اور بغیر تصنع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور ہیرو (HEROES) گھڑنے کا کھکیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو ع

"می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر" کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بُت تراشیں، لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پوری اُمتِ مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، اُمتِ مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مرکزیت' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرقِ اقصیٰ سے لے کر مغربِ بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENEITY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور 'علاقائی شخصیتوں' کو بس ایک حد تک ہی اُبھارنا چاہیے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے 'وحدتِ ملّت' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ تر عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی۔ پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں 'محصور' ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیئتِ اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ 'مقامِ رسالت' کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق ہے)

دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور

گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف وانتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایکؔ وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرؔے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدباب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[۱] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرز عمل یعنی ا: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے۔ گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئت اجتماعیہ کو کرنا چاہیے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو ازسرنو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرر مؤکد ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ جب پوری ہیئت اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں اُن چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لیے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ۱۔ تمسخر (اس کے سدباب کے لیے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر و قیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں

---

[۱] اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے)

بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳۔ تنابزبا لالقاب یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴۔ سوءِ ظن (اس لیے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵۔ تجسّس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لیے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لیے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہر حال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دار و مدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کے استحکام کیلئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے، اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبت و اُلفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ ع "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے!" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصّہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزت و ذلّت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف 'تقویٰ' ہے، اس لیے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر

رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن[1] بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائق توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اُوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی اُن کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے یہ کہ اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہلِ ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیارِ عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورۃ الحجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورۃ النساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اُس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین

---

[1] چنانچہ ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) نے اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کر لے اسے "اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے، بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفیٔ کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہو جاتے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی ہے:-

ایک[2] یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق، بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا، یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورٌ اور رحیمٌ سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں جب "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دَور میں امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے[2] یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم[2] پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہدایتِ آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے

---

[1] (CALL THE ROSE BY ANY NAME IT WILL SMELL AS SWEET)

[2] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

جان ومال سے کوشش کرے اور اس جدوجہد میں تن من دھن سب قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

سورۃ الحجرات کی اس آیہ کریمہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ) پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزوِ ثانی ختم اور جزوِ ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے' ایک ایمانِ حقیقی جو جامع ہے ایمانِ قولی اور عملِ صالح دونوں کا' اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا۔ چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم - بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ صَدَقَ اللّٰہ العَظِیم

"اے ایمان والو! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔"

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے' اس کا درس نمبر چودہ سورۃ الحجرات مشتمل ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ' جو اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ہے' ۲۶ویں پارے میں سورۃ الفتح کے فوراً بعد وارد ہوئی ہے۔ اگر اس کے مضامین پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات میں جو مضامین آئے ہیں' یہ پوری سورۂ مبارکہ ان کی مزید تشریح اور توضیح پر مشتمل ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں ربط مضمون کے اعتبار سے اس کا جو مقام ہے' اسے بھی ذہن میں تازہ کر لینا' اِن شاء اللہ' مفید ہو گا۔ اس منتخب نصاب کا تیسرا حصہ اعمالِ صالحہ کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اعمالِ انسانی کے ضمن میں پہلے دو دروس میں انفرادی سیرت و کردار سے متعلق قرآن مجید کی رہنمائی ہمارے سامنے آئی تھی۔ اس کے بعد ایک درس

میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم ہے‘یعنی گھریلو زندگی ‘خاندان کا ادارہ‘ عائلی نظام‘ اس سے متعلق ہم نے پوری سورۃ التحریم پڑھی تھی۔ اجتماعی زندگی میں اس سے بلند تر سطح پر ہماری معاشرتی یا سماجی زندگی کا دائرہ ہے۔ اس کے متعلق ہم نے گزشتہ درس میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیا تھا۔ اب جو اجتماعیت کی بلند ترین سطح ہے‘یعنی قومی و ملی اور سیاسی و ریاستی زندگی‘ اس سے متعلق نہایت اہم مضامین اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہو رہے ہیں۔

قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قرآن حکیم اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسی عام طور پر انسانی تصانیف ہوتی ہیں۔ انسانی تصنیف میں ابواب ہوتے ہیں۔ پھر ہر باب کا ایک عنوان ہوتا ہے جو اس باب کے مضامین کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر وہ باب ذیلی عنوانات یا فصول میں منقسم ہوتا ہے اور ہر فصل میں بحث کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے‘ جبکہ قرآن مجید در حقیقت اس نوع کی کتاب نہیں ہے‘ بلکہ اسے ہم خطباتِ الٰہیہ کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ تعبیر غلط نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مختلف مواقع اور مراحل پر یہ خطباتِ الٰہیہ نازل ہوتے رہے اور حضور ﷺ کی انقلابی دعوتِ توحید کو جن حالات‘ موانعات‘ اعتراضات اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آتا تھا‘ ان کی مناسبت سے حضور ﷺ کو ہدایات دی جاتی رہی ہیں اور متعلقہ بحثیں نازل ہوتی رہیں۔ ان ہی کے ضمن میں وہ دائمی و ابدی رہنما اصول بھی دے دیئے گئے جن پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی استوار دیکھنا چاہتا ہے‘ لیکن ان کے لئے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبر لازم ہے۔ ان کو معلوم اور اخذ کرنے کے لئے آیات کے بین السطور جھانکنا پڑتا ہے اور سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے یہ چیز معین کرنی پڑتی ہے کہ یہاں کون سے دائمی اور ابدی رہنما اصول ہمیں مل رہے ہیں۔

اس پہلو سے اگر غور کریں تو اگرچہ سورۃ الحجرات کے شانِ نزول کے ضمن میں بھی ہمیں روایات ملتی ہیں‘ لیکن تفسیر قرآن کا ایک مستقل اصول ہے کہ "الاعتبارُ لعموم اللفظ لالخصوص السبب" یعنی قرآن مجید کے فہم کے ضمن میں اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا‘ نہ کہ اس کے سبب کا جو کسی خاص واقعہ کے اعتبار سے شانِ نزول بنا ہے۔ اگر اس عموم کو پیش نظر رکھیں گے تو واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے کہ

ریاست کی سطح پر اس سورۂ مبارکہ میں کتنی اعلیٰ ترین اور جامع ترین رہنمائی دے دی گئی ہے۔ حالانکہ تصورِ ریاست (Concept of State) انسانی تاریخ کے اعتبار سے ایک جدید تصور ہے' لیکن قرآن مجید نے ریاست کی سطح پر ان دائمی و بنیادی اصولوں کی رہنمائی نوعِ انسانی کو عطا فرما دی تھی کہ جنہیں اسلامی ریاست میں رُوبعمل لایا جائے گا۔ ان سب کے لئے بنیادی و اساسی رہنمائی ہمیں اس سورۂ مبارکہ میں مل جاتی ہے۔

اس سورت کو ہم بغرضِ تفہیم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات جان لیجئے کہ یہ تقسیم قطعی تعیین کے ساتھ نہیں ہوگی بلکہ مضامین کی overlapping ہوگی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کے تین حصے ہیں جو تقریباً چھ چھ آیات پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصہ میں اسلامی ہیئت اجتماعیہ کے جو بنیادی اصول ہیں اور جن ستونوں پر یہ عمارت کھڑی ہے' ان کو معین کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کو انتشار سے بچانے اور اُمت کی شیرازہ بندی کو قائم و برقرار رکھنے کے ضمن میں آٹھ احکام دیئے گئے ہیں' جن میں ہم دیکھیں گے کہ دو بہت اہم اور بنیادی احکام ہیں اور چھ ان دونوں کے مقابلہ میں نسبتاً چھوٹے احکام ہیں۔ آخری حصہ میں پھر ایک تو یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا پوری نوعِ انسانی کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اور ان تعلقات کی بنیادیں کیا ہیں؟ پھر سب سے اہم مسئلہ یہ زیرِ بحث آتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں کسی شخص کو شامل کرنے کے لئے معیار کیا ہے؟ یا زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اور اساس کیا ہے؟ پھر اس کے ضمن میں ایک اہم مضمون آئے گا جس پر یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوگی کہ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے؟ میں نے بطور تمہید ایک اجمالی اور مختصر سا جائزہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ ہیں وہ اہم مضامین جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی کا اصل الاصول

اس تمہید کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت پر اپنی توجہات کو مرتکز کریں۔ فرمایا : ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ)

سے آگے مت بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور جان رکھو کہ اللہ (ہر چیز کا) سننے والا' جاننے والا ہے" ـــــ اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ جیسے ایک مسلمان فرد' اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند ہوتا ہے' اور اس کے لئے مادر پدر آزادی کا کہیں وجود نہیں ہے' ویسے ہی ایک مسلمان معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست بھی مادر پدر آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابند ہے۔ اسلام میں آزادی کا تصور یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے لئے ہر نوع کی دوسری غلامی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ علامہ اقبال نے اسے یوں ادا کیا ہے۔ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے اس طور سے تعبیر فرمایا ((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِی اٰخِیَّتِہٖ)) (مسند احمد) "مؤمن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے" ـــــ بڑی پیاری تمثیل ہے۔ ایک گھوڑا تو وہ ہے جس پر کوئی پابندی نہیں ہے' کوئی بندش نہیں ہے' وہ جدھر چاہے منہ مارے' جدھر چاہے زقند لگائے' آزادی کے ساتھ جس طرف چاہے اور جہاں تک چاہے خوب دوڑ لگائے۔ اس کے برعکس ایک گھوڑا وہ ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اب آپ فرض کیجئے کہ دس گز کی ایک رسی ہے جس سے وہ گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا دس گز نصف قطر کے دائرہ کے اندر وہ گھوم پھر سکتا ہے۔ اس گھوڑے کو اتنی آزادی ہے کہ وہ اس دائرے کے اندر جس طرف چاہے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جا کر بیٹھ جائے' مزید آگے جانا چاہے تو چند قدم اور اٹھالے' لیکن دس گز سے آگے ہرگز نہیں جا سکتا' اس لئے کہ وہ بندھا ہوا ہے ـــــ بقول اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تو یہ نہایت بلیغ تمثیل اور تشبیہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دی کہ ایک بندۂ مؤمن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام اور اوامر و نواہی کا پابند ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب مسلمان فرد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند ہے

تو مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ان سے کیسے آزاد ہو جائے گی؟ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ان احکام کی پابندی ضروری ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ عائلی زندگی اجتماعیت کی پہلی سطح ہے' معاشرتی زندگی اس سے بلند تر سطح ہے اور سیاسی زندگی یعنی ریاستی سطح پر ہمارے معاملات' یہ اجتماعیت کا بلند ترین تصور ہے۔ پس ہماری زندگی کی ہر سطح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابند ہے۔ اگر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ موجود ہے اور ان کی ایک آزاد خود مختار ریاست قائم ہے تو اس کے معاملات میں' اس کے دستور و آئین میں اور اس کے قوانین میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے حقیقی مفہوم اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے اس حصہ کا : ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے"۔ یہاں جو لفظ "تُقَدِّمُوْا" آیا ہے اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "مت آگے بڑھاؤ"۔ اس سے آگے لفظ "اَنْفُسَكُمْ" کہ "اپنے آپ کو آگے نہ بڑھاؤ" یا لفظ "رَاْيَكُم" کہ "اپنی رائے کو آگے مت بڑھاؤ" محذوف ماننا پڑے گا۔ ﴿ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "اللہ اور اس کے رسول سے" ـــــ آیت کا یہ حصہ دونوں محذوف الفاظ کے ساتھ جڑا رہے گا۔ مفہوم یہ ہو گا کہ یہ ایک دائرہ ہے۔ تمہاری زندگی خواہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو' خواہ اجتماعی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتی ہو' اس دائرے کے اندر اندر محدود رہنی چاہئے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ اسلامی ریاست کی سطح پر اس کی حیاتِ اجتماعی اور دستورِ اساسی کا اصل الاصول ہے' یا یوں کہئے کہ اس کی پہلی دفعہ اس آیت سے معین ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ریاست کے ضمن میں سب سے پہلی بحث یہ آئے گی کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اور اسلامی ریاست میں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ہے ـــــ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

لہٰذا مسلم معاشرتی نظریہ (Muslim Social Thought) یا مسلم سیاسی خیال (Muslim Political Thought) میں اساسی و بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ

حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ معروف الفاظ سورۂ یوسف کے ہیں : ﴿ اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ ﴾ یعنی "حکم دینے کا اختیارِ مطلق اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے"۔ اسی بات کو سورۃ الکہف میں منفی انداز میں یوں فرمایا : ﴿ وَلاَ یُشْرِکُ فِی حُکْمِہٖ اَحَدًا ○ ﴾ "اور وہ اپنے حکم (کے اختیار) میں کسی کو شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے" ــــــ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے اصول کا انسانی معاشرہ میں عملی طور پر جو نفاذ ہو گا وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے واسطہ سے ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ تو غیب کے پردوں میں ہے' اس کا حکم سب لوگوں کو براہ راست نہیں پہنچتا بلکہ اس نے اپنے احکام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنی حکمت بالغہ سے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا جس کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیین سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ــــــ لہٰذا حاکمیت الٰہیہ کی جو عملی تشکیل ہو گی وہ سورۃ النساء کی اس آیت کے حوالے سے ہو گی کہ ﴿ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ﴾ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہیں ان کی"۔ اس آیۂ مبارکہ میں "اَطِیْعُوْا" جو صیغہ امر ہے' دو مرتبہ آیا ہے' اللہ کے ساتھ بھی اور رسول ﷺ کے ساتھ بھی۔ ﴿ اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی" ــــــ لیکن آگے جب اس اطاعت کی زنجیر کی تیسری کڑی آئی تو فعل امر "اَطِیْعُوْا" کو لوٹایا نہیں گیا بلکہ فرمایا گیا : ﴿ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ﴾ "اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں" ــــــ اس اسلوب سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بالذات اور مطلق ہے' جبکہ "اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کی اطاعت مشروط ہو گی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرہ کے اندر اندر حکم دے سکتے ہیں' اس کے باہر نہیں۔ اس کے لئے نبی اکرم ﷺ نے دائمی طور پر یہ اصل الاصول معین فرما دیا ہے کہ ((لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ)) یعنی کسی ایسے معاملہ میں مخلوق میں سے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی معصیت یعنی اللہ کی نافرمانی لازم آ رہی ہو۔

پس قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ

کی اطاعت کے جو احکام دیئے گئے ہیں' ان سب کو جمع کیا جائے تو اس کا جو حاصل نکلتا ہے اسے بڑی جامعیت اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں بایں الفاظِ مبارکہ بیان فرمادیا گیا ہے : ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے۔"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ بڑے دستوری' آئینی اور قانونی الفاظ ہیں اس اصول الاصول کی تعیین کے لئے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام امور و مسائل اور معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر رہیں گے' اس سے تجاوز جائز نہیں ہو گا۔ البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے حسب حالات اور حسب موقع اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اہل لغت و نحو تمام کے تمام اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ "امر" کے مقابلہ میں "نہی" میں زیادہ زور (emphasis) ہوتا ہے۔ یعنی ایک یہ کہ حکم دیا جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" اور دوسرے یہ کہ بات یوں کہی جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے مت بڑھو" تو یہ جو دوسرا انداز ہے اس میں تاکید کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

پھر یہ کہ اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ الفاظ نہایت جامع (comprehensive) ہیں۔ یہ الفاظ اس طریقہ سے اس بات کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے جو واضح احکام ہیں ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکے گا' ان کے اندر اندر آزادی حاصل ہے' جیسے گھوڑے کی مثال کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کو بس اتنی آزادی ہے کہ وہ اپنی رسی کی مقدار کے مطابق ایک معین دائرے کے اندر اندر گھوم پھر سکتا ہے اور جس سمت چاہے اور رسی کی حدود میں رہتے ہوئے جتنے فاصلے پر چاہے جا کر بیٹھ سکتا ہے۔ لہٰذا سورۃ الحجرات کے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک دائرہ کھینچ دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی حیثیت "حدود اللہ" کی ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس دائرے کے اندر اندر تمہیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے ریاستی' ملکی اور انتظامی امور اپنی

صوابدید سے طے کر سکتے ہو' اپنے قوانین بنا سکتے ہو۔

اسلامی ریاست میں شوریٰ کی اہمیت

لیکن اس کے لئے ایک اصل الاصول سورۃ الشوریٰ میں بیان کر دیا گیا ہے جسے اختیارات کے دائرے میں بہرحال ملحوظ رکھنا ہو گا۔ وہ اصل الاصول یہ ہے کہ ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ "اور (اہل ایمان) اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں۔" (آیت ۳۸) یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرے کے اندر بھی کسی فردِ واحد' کسی خاندان' کسی طبقہ یا کسی گروہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قوت نافذہ پر قابض ہو کر اس طرح بیٹھ جائے کہ گویا وہ اصل حکمران ہیں اور بقیہ لوگ صرف ان کی رعیت ہیں کہ جس طرح چاہیں ان پر اپنی مرضی ٹھونس دیں۔ اسلام اس نوع کے Authoritarianism اور Totalitarianism کی یعنی کسی فرد' طبقے' گروہ یا خاندان میں اختیارات کے ارتکاز کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے شورائیت کا نظام ازروئے قرآن مجید لازم ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں یہ اصل الاصول اور اسلامی نظامِ حیات کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجتماعی امور جن کے متعلق قرآن و سنّت میں کوئی صریح حکم یا ہدایت نہ ہو' مشورے سے انجام پاتے ہیں۔

البتہ یہاں شوریٰ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی گئی ہے اور اس کے بارے میں ہمیں قرآن میں کسی دوسرے مقام پر بھی کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ملتا کہ نظامِ حکومت کیا ہو!۔ صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو! وحدانی ہو کہ وفاقی ہو! اور اگر عام انتخاب ہوں تو اس کے لئے ووٹ کا حق کسے ہے' کسے نہیں ہے؟ یہ تمام معاملات انتظامی امور ہیں۔ تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے جس سطح پر جو معاشرہ ہو گا' اس کی مناسبت سے ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ کے اصول کے پیش نظر تمام معاملات اس دائرے کے اندر اندر رہیں جو کتاب و سنّت نے کھینچ دیا ہے۔ اور یہ معاملات باہمی مشورے سے انجام پائیں۔ نظامِ شورائیت کی کوئی معین شکل نہ دینے کی یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کے دائمی و ابدی اوامر و نواہی اور احکام ساری دنیا کے لئے' ہر دَور اور ہر زمانہ کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ہیں' لہٰذا شوریٰ کا ایک خاص طریقہ ہر دَور' ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لئے

یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ البتہ شوریٰ کا جو قاعدہ آیت کے اس حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ "(اہل ایمان) اپنے کام باہم مشاورت سے چلاتے ہیں" یہ قاعدہ تین باتوں کا متقاضی ہے۔ ایک یہ کہ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو' ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہئے' خواہ وہ براہ راست شریک ہوں' یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے شریک ہوں۔ دوسرے یہ کہ مشورہ آزادانہ' بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہئے۔ دباؤ یا لالچ کے تحت مشورہ لینا مشورہ نہ لینے کے برابر ہے۔ تیسرے یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اتفاقِ رائے سے دیا جائے یا جسے ان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق حکومت اور اجتماعیت کے تمام معاملات چلائے جائیں۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہم نے قائداعظم محمد علی جناح کے الفاظ میں اس لئے حاصل کی تھی کہ ہم ایک آزاد و خود مختار خطہ اس مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو ابدی اصول ہیں ہم اس مملکت کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک تجربہ گاہ بنائیں' اسے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ اور نمونہ کی ایک اسلامی ریاست بنا کر پوری دنیا کے سامنے پیش کریں۔

الحمد للہ ہمارے یہاں "قراردادِ مقاصد" میں یہ بات طے ہو گئی کہ "حاکمیت مطلقہ اللہ کی ہے"۔ ہم نے پہلی بار اس اصول سے دنیا کو روشناس کرایا اور یہ بات پیش نظر رکھئے کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ کسی آزاد و خود مختار اور ذمہ دار اسمبلی نے (وہ ہماری دستور ساز اسمبلی تھی) اس طریقہ سے ایک اجتماعی فیصلہ کا اعلان و اظہار کیا کہ ریاست میں حاکمیت مطلقہ اللہ کی ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کی سطح پر یہ گویا کلمۂ شہادت تھا : اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللّٰهِ جس کا اعلان و اظہار قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے پوری دنیا کے سامنے ہوا۔ اور میں آج خراجِ تحسین ادا کرنا چاہتا ہوں اُس شخص یا ان اُشخاص کو جنہوں نے اس دفعہ کے الفاظ معین کئے ہیں جو ہمیشہ سے دستور پاکستان کے رہنما اصولوں میں شامل رہی ہے۔

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

"کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن اور سُنّت سے متخالف اور

متصادم ہو۔"

میں نہیں جانتا کہ ان کے پیش نظر سورۃ الحجرات کی یہ آیۂ مبارکہ تھی یا نہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ کامل ترین نمائندگی کرتے ہیں اس آیۂ مبارکہ کے الفاظ کی ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ "مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان' قرآن مجید ہے۔ اگر آپ اس سے آگے نہیں بڑھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اللہ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنّت آپؐ کے افعال و اقوال پر مشتمل ہے۔ اگر ہم اس سے آگے نہ بڑھنے کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے احکام کے دائرہ کے اندر رہنے کا عزم کیا ہے ــــ میرے نزدیک یہ دفعہ اسلامی دستور کی بنیادی شرط کو بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورا کرتی ہے' بشرطیکہ یہ دفعہ محض رہنما اصول (Directive Principles) میں نہ ہو بلکہ نافذ العمل دفعات (Operative Clauses) میں شامل ہو۔ بدقسمتی سے ہماری کوتاہی یہ رہی ہے کہ اس کو تاحال نافذ العمل دفعہ بنانے کے بجائے صرف رہنما اصولوں میں رکھا گیا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام کی صورت میں یوں سمجھئے کہ اس دفعہ پر عمل کا کسی نہ کسی درجے میں آغاز ہوا ہے[1] اور دورِ جدید میں اسلامی ریاست کے تقاضوں میں سے ایک بنیادی تقاضے کو' ناقص شکل ہی میں سہی' پورا کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اللہ کرے کہ وہ دن جلد از جلد پاکستان پر طلوع ہو کہ اسلامی ریاست کے جو بھی تقاضے ہیں ان پر بھرپور انداز اور عزم بالجزم سے اقدامات شروع ہوں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ

---

(۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب پاکستان ٹیلی ویژن پر ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران نشر ہوا تھا۔ (مرتب)

صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○
یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا
بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ○ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ
اللّٰهِ ؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ
اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ
وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ○ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ
عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ○ ﴾ (آیات ۲۔۸)

"اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور مت گفتگو کرو ان ؐ سے بلند آوازی کے ساتھ جیسے تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کر لیتے ہو' مبادا تمہارے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو۔ یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول (ﷺ) کے سامنے پست رکھتے ہیں' وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اے نبی (ﷺ) آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے باہر سے' ان میں اکثر نا سمجھ ہیں۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود ان کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لئے کہیں بہتر تھا۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو' مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔ اور جان رکھو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول (ﷺ) موجود ہیں۔ اگر وہؐ تمہارا کہنا اکثر معاملات میں ماننے لگیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے' لیکن اللہ نے تو ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' اور تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر کو بھی اور نافرمانی کو بھی اور معصیت کو بھی۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اصل میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور مظہر ہے اس کی نعمت کا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔"

مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی دوسری اہم بنیاد

نبیّ اکرم ﷺ کا ادب واحترام

سورۃ الحجرات کی آیات ۲ تا ۸ میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ یا ان کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کی جو دوسری اہم بنیاد ہے' اس کا ذکر ہے۔ پہلی بنیاد جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں ہے' دستوری اور آئینی نوعیت کی تھی کہ ایک اسلامی ریاست یا ایک اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ یا ایک اسلامی معاشرہ پابند ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا دائرہ وہ دائرہ ہے کہ مسلمان خواہ فرد ہو' خواہ معاشرہ ہو' خواہ پوری ملّتِ اسلامیہ ہو' خواہ کوئی اسلامی ریاست ہو وہ اس دائرے کے اندر محدود رہے گی۔ اب اس دائرے کا ایک مرکز بھی ہے اور مرکزی شخصیت ہے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی۔ اور مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی شیرازہ بندی میں جہاں اس پہلی اصل کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے جو دستوری و آئینی اصل ہے' وہاں دوسری بنیاد مرکزی نقطہ کی حیثیت کی حامل ہے کہ حضور ﷺ سے دلی محبت ہو' حضور ﷺ سے عقیدت ہو' حضور ﷺ کا ادب واحترام ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم ہو۔ گویا فی الجملہ ہر مسلمان کے دل میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپؐ کی تعظیم جاگزیں ہو۔

یہ در حقیقت وہ جذباتی بنیاد ہے جس سے ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب کا نقشہ بنتا ہے ـــــ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان میں صرف عقل و ذہانت (Intellect) ہی نہیں بلکہ اس میں جذبات (sentiments) بھی ہیں۔ اور کسی بھی معاشرے میں جہاں اس کی عقلی اور فلسفیانہ اساسات کو اہمیت حاصل ہے' وہاں جذبات کے لئے بھی کوئی مرکز ضروری ہے' جس کے ساتھ اگر جذباتی وابستگی نہیں ہوگی تو دل پھٹے رہیں گے' آپس میں بُعد رہے گا اور ثقافت میں کوئی یک رنگی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ کوئی تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی (Cultural Homogenity) وجود میں نہیں آ سکے گی۔ ایک مسلمان معاشرے میں یہ مطلوبہ کیفیت در حقیقت نبی اکرم ﷺ کے اتباع کے ذریعے سے ہی پیدا

ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ایک ہے اطاعت اور ایک ہے اتباع ـــــ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اطاعت نام ہے اس رویہ کا کہ جو حکم ملے اسے پورا کر دیا جائے ـــــ اور یہ رویہ تو اصل میں اس دستوری اور آئینی بنیاد کا جزو ہے جس پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو عمل بھی اُس شخصیت سے منسوب ہے جسے اللہ کا رسول مانا گیا ہے' جس پر ایمان لایا گیا ہے' جس کی اللہ کے نبی و رسول کی حیثیت سے تصدیق کی گئی ہے' اب اس شخصیت کی نشست و برخاست کا' اس کی گفتگو کا' اس کے رہن سہن کا' اس کی وضع قطع' اس کی تہذیب اور اس کی پوری نجی و مجلسی زندگی کا جو بھی انداز ہو' اس پورے نقشے کو اپنے سیرت و کردار میں جذب کرنا' اس رویہ اور اس کیفیت کا نام دراصل اتباع ہے ـــــ اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

ثقافتی ہم آہنگی کا اہم ذریعہ : اتّباعِ رسولؐ

پھر یہ کہ مسلمانوں کی تہذیب اور اس کے تمدن کے جو اصل خدوخال ہیں وہ درحقیقت اسی اتباعِ رسول ﷺ سے وجود میں آئے ہیں ـــــ یہ بات پیش نظر رہے کہ ہر معاشرے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے ایک خاص پس منظر میں کہا ہے کہ ع "خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر" تو آپ اسے چاہے انسان کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شمار کریں' لیکن یہ انسان کی عالمگیر (universal) کمزوری ہے کہ کوئی دل آویز اور دلنواز شخصیت ایسی ہو کہ اگر اس سے محبت اور قلبی لگاؤ ہے تو اس معاشرے کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے قریب رہیں گے' ان کے دلوں کی دھڑکنوں میں ہم آہنگی ہوگی۔ انسان کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے قلبی لگاؤ کے لئے ایسی شخصیت موجود ہو جو معاشرے کی شیرازہ بندی میں نقطۂ ماسکہ کا کردار ادا کرے۔ اسے آپ ہیرو کہیں' آپ اسے کسی دوسرے اعلیٰ لقب سے پکاریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام معاشروں کو یہ ہیرو باقاعدہ گھڑنے پڑتے ہیں' یہ شخصیتیں تراشنی پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔ جذباتی وابستگی کے لئے ایک ایسا مرکز لازم ہے۔

کتنی بڑی خوش قسمتی ہے امت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی کہ یہاں کوئی

مصنوعی شخصیت تراشنے اور گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسروں کو تو مصنوعی شخصیتیں گھڑنی پڑتی ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انہیں ایک نئی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے علامہ اقبال کا یہ مصرع بڑا پیارا ہے کہ ؏ "می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر!" لیکن ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ کی محبوب' دلنواز' دلآویز' من موہنی' معراجِ انسانیت پر فائز شخصیت' جن کی سیرت و کردار پر کوئی دشمن بھی کہیں کوئی انگلی نہ رکھ سکا' انسانِ کامل' انسانی عظمت کا مظہرِ اتم شخصیت موجود ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت ہماری ملی شیرازہ بندی کے لئے مرکزی شخصیت ہے۔ آپؐ کے ساتھ دلی محبت' آپؐ کا ادب' آپؐ کی تعظیم' آپؐ کا احترام' آپؐ سے عقیدت' اگر اسلامی معاشرہ میں ان تمام امور کا جذبہ موجود رہے گا تو معاشرہ بنیانِ مرصوص بنا رہے گا۔ آپ ﷺ وہ شخصیت ہیں کہ جن کے متعلق بالکل صحیح کہا گیا ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

آپؐ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اب اگر ہم ان دونوں کو جمع کریں تو ایک ہے ہماری ہیئت اجتماعیہ یا حیات ملی کے لئے دستوری' آئینی اور قانونی بنیاد ـــــ اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت۔ یہ گویا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے کے درمیان ہے ایک انتہائی دلنواز اور دلآویز شخصیت' بقول شاعر ؏ "نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُرسوز" کا مصداقِ کامل ـــــ اس کے لئے اگر "مرکز ملت" کی اصطلاح اختیار کی جائے تو مجھے اعتراض نہیں' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمارا یہ مرکز دائم و قائم ہے۔ یہ کسی بھی دور میں بدلنے والا نہیں ہے' بلکہ یہ تو ہمیشہ ہمیش کے لئے تاقیامِ قیامت جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی شخصیت ہے جو "مرکز ملت" کے مقام پر فائز رہے گی اور حضور ﷺ ہی کو معیارِ مطلق بنانا ہوگا۔ مختلف مسلمان معاشروں اور مختلف مسلمان ملکوں میں یقیناً جب رہنما اور مصلح سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان سے محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ترکوں کے دلوں میں

مصطفیٰ کمال کی عظمت ہے تو ٹھیک ہے' وہ ان کے محسن تھے۔ اسی طرح پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں اگر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی محبت ہے تو درست ہے' وہ ہمارے محسن ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اور جو ابدی معیار قائم و دائم رہے گا وہ شخصیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ اگر ہم نے اس معیار کو مجروح کر دیا تو یہ جان لیجئے کہ پھر مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی ایک اہم اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا وہ معیار ہے جو مستقل ہے' دائم و قائم ہے۔ یہ نہ صرف ہماری تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کی ضمانت دیتا ہے' بلکہ اس تہذیبی و ثقافتی ہم رنگی' ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ تہذیب و ثقافت کا ایک تسلسل و تواتر ہے جو چودہ سو سال سے جاری و ساری ہے۔ وضع قطع اور لباس کے حدود و قیود اور نشست و برخاست کے انداز' حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع سے مسلمانوں میں فروغ پذیر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان چاہے مشرق بعید کے رہنے والے ہوں یا مغرب بعید کے' غرض دنیا کے کسی خطے میں بسنے والے مسلمان ہوں' ان سب کے درمیان ایک مناسبت' ہم رنگی' اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ ان کے لئے مرکزی شخصیت ہمیشہ ہمیش کے لئے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔

مرتبہ و مقامِ محمدیؐ کا لحاظ اشد ضروری ہے

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن میں لوگوں سے کچھ بے احتیاطی ہوئی' جس سے حضور ﷺ کا بلند' ارفع و اعلیٰ مقام مجروح ہونے کا کچھ اندیشہ ہوا۔ کسی نے کبھی اپنی آواز کو حضور ﷺ کی آواز سے کچھ بلند کر لیا ـــــ اس پر فرمایا گیا کہ مسلمانو! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ یہ وہ عمل ہے کہ تمہیں محسوس بھی نہیں ہو گا لیکن یہ اتنی بڑی گستاخی شمار ہو گی کہ تمہارے پچھلے کئے کرائے سارے اعمال رائیگاں جائیں گے' تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں گی ـــــ پھر مثبت انداز میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم اور اس کی افزائش کے لئے انہی حضرات کے دلوں کو جانچ کر اور پرکھ کر منتخب فرما لیا ہے کہ جو اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز کے سامنے پست رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں باہر سے آنے والے بدوؤں سے کچھ بے احتیاطی ہو جاتی تھی۔ جیسے کتب سیرت میں واقعہ ملتا ہے کہ بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے اور جیسا کہ وہاں کے بدوؤں کا ایک مزاج تھا' انہوں نے مسجد نبوی

میں آکر پکارنا شروع کر دیا "یا محمد اُخرج علینا" یعنی۔ "اے محمد (ﷺ) باہر آیئے" ـــــ اس پر ان کو ٹوک دیا گیا' لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ لوگ نا سمجھ ہیں۔ ان کی نیت میں خلل نہیں ہے' یہ ان کے مزاج کا اکھڑپن ہے جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے' اسی کا یہ ظہور ہے' لہٰذا ٹوکنے کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ: ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ "اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا ہے" لیکن احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آیت ۶ میں جو بات آئی ہے' اس پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہو گی۔ گزشتہ نشست میں مَیں نے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو تین موضوعات میں تقسیم کیا تھا۔ چھٹی آیت کا تعلق ان معین موضوعات میں سے دوسرے موضوع سے ہے' لیکن آیات ۷ اور ۸ میں وہ اہم ترین بات آئی ہے جو آج کی گفتگو سے متعلق ہے۔

فرمایا : ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ "اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مابین (جو محمد ﷺ کی شخصیت ہے وہ) اللہ کے رسول ہیں" ـــــ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہیں' لیکن تمہیں آپؐ کی جو شان ہر آن ملحوظ رکھنی چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ حضور ﷺ میرے بھتیجے ہیں' آپؐ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں جیسا ایک بڑا اپنے چھوٹے سے کرتا ہے تو یہاں حضور ﷺ کی رسول کی حیثیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ ﴾ "اور جان لو تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں"۔ ان کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو ایک اُمتی کو رسول کے ساتھ کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ادب و احترام اور آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کو ہر آن ملحوظ رکھو ـــــ اس ضمن میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ نقشہ خاص طور پر سامنے لایا گیا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو راسخ اور جاگزیں کر دیا ہے' اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' تمہارے دلوں کو ایمان سے مزین کر دیا ہے اور کفر و فسق سے اور معصیت سے تمہیں طبعاً نفرت ہو چکی ہے۔ اس اسلوب میں جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح ہے' وہاں یہ ترغیب و تشویق کا بھی انداز ہے کہ اس معاملے میں ذرا احتیاط ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضور ﷺ کی رسول اللہ ہونے کی حیثیت کسی حال میں بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔

مقامِ رسالت کے حوالے سے ہماری ذمہ داری؟

آخری بات یہ سامنے رکھئے کہ اس حکم پر ہم کیسے عمل کریں! اس کا تعلق ہم سے یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ثابت شدہ سنتیں اور حضور ﷺ کی احادیث حضور ﷺ کی قائم مقام ہیں۔ نبی اکرم ﷺ آج بھی معناً ہمارے مابین موجود ہیں' اس لئے کہ حضور ﷺ کی سنتیں آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ آج بھی نصف النہار کے خورشید کی طرح درخشاں و تاباں ہے۔ ہمارے سامنے جب بھی کوئی بات حضور ﷺ کی آئے ہمیں اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے' اپنے فلسفے بگھارنے بند کر دینے چاہئیں' اپنی منطق کو پس پشت ڈال دینا چاہئے' اپنے "اقوال" پر تالا ڈال دینا چاہئے۔ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات فرمائی یا نہیں فرمائی' لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی حدیث کے حوالے سے جب بات سامنے آئے تو زبان فوراً بند ہو جائے' سر فوراً جھکا دیئے جائیں۔ بعد میں اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ روایت صحیح نہیں تو ٹھیک ہے' اس پر اب عمل نہیں ہو گا۔ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی کوئی بات اگر سامنے آئے تو فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے برعکس پھر بھی ہم اپنے فلسفے چھانٹیں اور اپنی منطق بگھاریں تو یہ وہ طرزِ عمل ہو جائے گا کہ ﴿ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ ﴾ "مبادا تمہارے تمام اعمال اکارت ہو جائیں" ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ "اور تمہیں اس کا ادراک و احساس تک نہ ہو۔"

اس کے بعد ہم آیت ۶ اور آیات ۹'۱۰ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ فرمایا :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ ﴾ (آیت ۶)

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ ﴾ (آیات ۹، ۱۰)

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو۔ مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے"۔

اس کے بعد فرمایا :

"اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرا دو' اور اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرنے پر مصر رہے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ پھر اگر وہ اللہ کے حکم کو تسلیم کر لے تو پھر صلح کرا دو ان دونوں کے مابین انصاف کے ساتھ' اور عدل سے کام لو' یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے مابین صلح کرا دیا کرو' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

دو بڑے احکام :

اہم خبروں کی چھان پھٹک اور نزاع کی صورت میں صلح کرانے کا حکم

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی شیرازہ بندی کو مستحکم رکھنے کے لئے چند نہایت اہم احکام ہیں جو سورۃ الحجرات میں وارد ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی حیاتِ ملی یا ہیئت اجتماعیہ کی جو دو بنیادیں ہیں ان کی نشاندہی بھی ہو چکی ہے۔ ایک دستوری' آئینی و قانونی بنیاد جس پر نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے۔ دوسری وہ جذباتی بنیاد جس سے تمدن اور تہذیب و ثقافت وجود میں آتی ہے ــــ اب اس ہیئت اجتماعیہ کی شیرازہ بندی کو مضبوط رکھنے کے لئے دو احکام زیر مطالعہ آیات میں وارد ہوئے ہیں اور یہ دونوں احکام نہایت اہم ہیں۔

افواہوں کی روک تھام

پہلا حکم یہ ہے کہ محض افواہ پر کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ اگر کہیں سے کوئی خبر آئے

اور خبر بھی اہم قسم کی ہو (عربی میں "نبا" اہم خبر کو کہتے ہیں) تو اس کے ضمن میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ خبر لانے والا کون ہے! اگر وہ کوئی انتہائی معتبر شخصیت ہو مثلاً حضرت ابو بکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی' یا علی مجتبیٰ جیسے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی خبر دے رہا ہو تو کسی تحقیق' کسی تبیین اور کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے' لیکن اگر اس خبر کو لانے والا کوئی ایسا شخص ہے کہ جو احکامِ الٰہیہ پر اس طور سے کاربند نہیں ہے جس طرح ایک مومن صادق کو ہونا چاہئے تو ایسے شخص کی لائی ہوئی خبر پر کوئی اقدام کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے' لہٰذا اس کی تحقیق' تبیین اور تفتیش ضروری ہے۔ اور اسی سے یہ بات ازخود سامنے آتی ہے کہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ جس کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص متقی ہے یا فاسق' تو سب سے پہلے اس شخص کے بارے میں تحقیق کرنی ہو گی کہ اس کا کردار کیسا ہے! اس کا اخلاق کیسا ہے! دین کے ساتھ اس کے رویئے اور طرز عمل کا معاملہ کیسا ہے! ـــــ تو یہ دونوں چیزیں سامنے رکھیئے کہ خبر لانے والے کے بارے میں بھی تحقیق و تفتیش ـــــ اور پھر جو "خبر" لائی گئی ہو' اس کے بارے میں بھی پوری چھان بین کرنی ضروری ہے۔ ان دونوں مرحلوں سے گزر کر پھر کوئی فیصلہ کیا جائے اور اس فیصلے کے مطابق پھر کوئی اقدام ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ان معاملات میں سہل انگاری سے کام لیا جائے اور ان احتیاطوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ نادانی' نادانستگی اور جہالت میں کسی غلط اطلاع کی بنیاد پر کوئی اہم اقدام ہو جائے اور بعد میں معلوم ہو کہ یہ اطلاع ہی سرے سے غلط تھی۔ یہ معاملہ عام طور پر خود ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے کہ ایک افواہ کہیں سے چلی اور پھر وہ بڑھتی چلی گئی' ایک کی زبان سے نکلی اور دوسرے کے کان تک پہنچی۔ اب دوسرے کی زبان سے نکلتی ہے تو اس میں اضافے ہوتے ہیں اور پھر یہ افواہ اضافوں کے ساتھ معاشرے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات بڑی اہم ہے کہ تحقیق و تفتیش کے ذریعے صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد کوئی اقدام ہو۔ اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمان بہت ہی پیارا ہے۔ آپ نے ہمارے سامنے ایک ایسا معیار رکھا ہے کہ واقعتاً اگر اس پر انسان کسی درجے میں بھی عمل پیرا ہو جائے تو اس طرح کے تمام اندیشوں کا سدباب ہو جائے گا۔ حضور ﷺ نے ارشاد

فرمایا : ((کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ)) ”کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے“ ــــــ اب دیکھئے کہ یہ بڑی عجیب اور بڑی پیاری بات ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے کسی سے کچھ سنا' اس میں کوئی اضافہ بھی نہیں کیا' وہی بات جوں کی توں آگے بیان کر دی تو یہ طرزِ عمل ہی اس کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔ غور کیجئے کہ بات کیا ہے! اسے یہ چاہئے تھا کہ اس بات کو اپنی زبان سے نکالنے سے پہلے خود اس کی تحقیق کر لیتا۔ بالفرض وہ بات غلط ہے تو اس غلط بات کے پھیلانے میں وہ بھی ایک واسطہ بن گیا۔ اس کے ذریعے سے وہ جھوٹ کتنی دور تک پھیل سکتا ہے' اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ کے معاملے میں خصوصی احتیاط

اب اس ضمن میں ایک بات مزید نوٹ کر لیں۔ زیرِ مطالعہ آیت سے اگلی آیت (نمبر ۷) جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں' اس میں خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کے مقام کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے کہ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ﴾ ساتویں آیت کے اس جزو کا چھٹی آیت سے بھی ربط ہے۔ وہ اس پہلو سے کہ تمام اطلاعات اور تمام خبروں کی تحقیق و تفتیش ہونی چاہئے' لیکن جو بات خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہو رہی ہو' چاہے وہ کتنی چھوٹی سے چھوٹی بات ہی کیوں نہ ہو' ہر مسلمان کے لئے وہ بات اس اعتبار سے بہت بڑی ہے کہ یہ حضور ﷺ کے فرمان کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ اسی سے تو ہماری ساری شریعت اور ہمارے تمام قوانین کا ڈھانچہ بنے گا اور اسی پر ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب و ثقافت کی تشکیل ہو گی' لہٰذا اس معاملہ میں سہل انگاری' صرفِ نظر یا تساہل عام معاملات کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

یہ ہے وہ اہم بات جس کے تحت ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ نے احادیث کی تحقیق و تفتیش میں اپنی پوری پوری زندگیاں لگا دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی احادیث بیان کرنے والے راویوں کے حالات کی بھی پوری چھان بین کی اور جرح و تعدیل کے اصول معین کئے۔ اس طرح اسماء الرجال کا ایک بہت بڑا علم اور ایک بہت بڑا فن وجود میں آیا۔ ہزاروں راویانِ احادیث کی زندگیوں کے بارے میں تحقیق ہوئی' پھر ان کے حالات مدون کر کے ضبطِ تحریر میں لائے گئے' پھر ان کی

درجہ بندی کی گئی۔ اگر کسی شخص نے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرکے کوئی بات کہی تو اسے محض اس بنیاد پر قبول اور تسلیم نہیں کرلیا جائے گا کہ یہ بات "قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم" کے الفاظ سے بیان کی گئی ہے' بلکہ اس کی پوری تحقیق و تفتیش اور پوری چھان بین ہوگی' روایتاً بھی ہوگی اور درایتاً بھی۔ ان راویوں کے حالات پر بھی جرح ہوگی جو اس کو بیان کرنے والے ہیں۔ حدیث میں جتنے بھی واسطے اور links ہیں' ان کی ثقاہت اور ان کے تدین کی بھی تحقیق ہوگی۔ پھر حدیث کے متن پر درایتاً بھی غور کیا جائے گا۔ یہ سارے کا سارا نظام درحقیقت اسی حکم کے تحت ہے کہ "اے اہل ایمان' اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی اہم خبر لے کر آئے تو تحقیق اور تفتیش کرلیا کرو"۔

باہمی نزاع کی صورت میں صلح کرانے کا حکم

اب آیئے اس دوسرے بڑے حکم کی طرف جو آیات نمبر۹ اور ۱۰ میں ہمارے سامنے آیا ـــــ اگر اس ساری احتیاط کے باوجود مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین کوئی نزاع برپا ہو جائے' کوئی جھگڑا ہو جائے' کسی نوع کا اختلاف ہو جائے اور یہ اس شدت کو پہنچ جائے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو ایک مسلم معاشرے کا کیا رویہ ہو! فرمایا: ﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا... ﴾ "اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں..." اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان بھی آخر انسان ہیں۔ خطا اور نسیان کا ارتکاب ہر انسان سے ہو سکتا ہے' لہٰذا مسلمانوں کے مابین اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے' وہ باہم لڑنے اور جھگڑنے لگ پڑیں تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے' ایسا ہو سکتا ہے۔ پوری نیک نیتی کے ساتھ بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ پھر حالات ایسی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ دونوں فریق اگرچہ نیک نیت ہوں' لیکن پھر بھی مسئلہ الجھتا چلا جائے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ کچھ خارجی عناصر بھی موجود ہوں اور کوئی سازشی عنصر اندر بھی موجود ہو کہ جو دونوں فریقوں کو بھڑکا رہا ہو' تو ہو سکتا ہے کہ خلوص اور نیک نیتی کے باوصف وہ جھگڑا باہمی قتال اور جنگ کی صورت اختیار کر جائے۔ اس صورتحال کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ان میں سے کسی ایک فریق کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جائے یا ان کے ایمان کی نفی کر دی جائے۔ واضح رہے کہ اس آیت کے آغاز میں دونوں لڑنے جھگڑنے والے گروہوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

اُقۡتَتَلُوۡا ﴾ "اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں"۔ چنانچہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی ایمان کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

مصالحت کا قانون

آگے چلئے' اس سورۂ مبارکہ کی آیات زیر مطالعہ میں ایک پورا قانون بیان ہوا ہے' جس کی کئی دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ یہ ہے کہ ﴿ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ﴾ کہ یہ تمہارا فرض ہے کہ ان کے مابین صلح کرادو۔ یعنی بے تعلقی کا رویہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیں مداخلت کی کیا ضرورت ہے' یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے جس سے وہ خود نمٹیں۔ یہ روش چھوٹی سطح پر بھی غلط ہے اور بڑی سطح پر انتہائی غلط ہے۔ اگر دو بھائیوں کے مابین اختلاف ہو گیا ہو اور بقیہ بھائی یا قریبی اعزہ یہ سوچیں کہ یہ اپنا اختلاف آپس ہی میں طے کریں' ہم اگر ایک کے حق میں بات کریں گے تو خواہ مخواہ دوسرے کی خفگی اور ناراضگی مول لیں گے اور دوسرے کے حق میں بات کریں گے تو پہلا خفا اور ناراض ہو جائے گا۔ تو یہ بے تعلقی کا رویہ بہت غلط ہے۔ اس کیلئے انگریزی محاورے "Nip the evit in the bud" کے مطابق عمل ہونا چاہئے۔ چنانچہ برائی نے جہاں بھی ظہور کیا ہے' وہ ایک رخنہ ہے جو مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ میں رونما ہوا ہے' اس فصیل میں ایک دراڑ پڑ گئی ہے' اگر یہ دراڑ بڑھ گئی تو اس سے غنیم کو اندر آنے کا موقع ملے گا' دشمن اندر گھس آئے گا' لہٰذا پہلی فرصت میں اس دراڑ کو بند کرو اور اس رخنے کو ختم کرو۔ چنانچہ حکم دیا گیا ﴿ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ﴾ یہ پہلی دفعہ ہے اور چونکہ "اَصۡلِحُوۡا" فعل امر ہے اور فقہ میں عام طور پر یہ اصول مانا جاتا ہے کہ "الامر للوجوب" پس معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں پر واجب اور فرض کیا جا رہا ہے کہ وہ مصالحت کرائیں۔

اب اس کے بعد دوسری دفعہ ہے ﴿ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى ﴾ "پس اگر (مصالحت اور صلح کی کوشش کے باوجود) ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرتا جا رہا ہے" ـــــ اس زیادتی کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گروہ مسلمانوں کی جو مجموعی طاقت اور قوت ہے' اسے صلح سے انکار کر کے ضعف پہنچانے کا سبب بن رہا ہے اور بے جا طور پر اپنی زیادتی پر مصر ہے۔ دوسری یہ کہ ان کے مابین جو صلح اور مصالحت کرائی گئی تھی' اس کی شرائط پر وہ کاربند نہیں رہا' اس نے از سرنو کوئی زیادتی کی ہے۔

ان دونوں حالتوں کے بارے میں حکم مل رہا ہے: ﴿ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِيْ ﴾ "اب تم اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے" ـــــ یعنی اب یہ جھگڑا دو فریقوں کے مابین نہیں رہا' بلکہ ملت کا بحیثیت مجموعی جو مقام و مرتبہ ہے' اس گروہ نے اسے چیلنج کیا ہے' وہ اسے غیر مؤثر بنانے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ لہٰذا اب اُمت کی مجموعی طاقت بروئے کار آئے اور وہ زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑ کر اسے مجبور کرے کہ وہ اس زیادتی سے باز آجائے۔ چنانچہ فرمایا ﴿ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ "یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے"۔ یہاں "امر اللہ" میں ان شرائط کی طرف اشارہ ہے جو ملت کی ہیئت اجتماعیہ نے ان دونوں فریقوں کے مابین طے کرائی تھیں۔ وہی شرائط درحقیقت امر اللہ ہیں۔

تیسری دفعہ یہ بیان فرمائی: ﴿ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ﴾ "پھر اگر وہ فریق لوٹ آئے' زیادتی سے باز آجائے تو پھر ان کے مابین از سرِنو عدل کے ساتھ صلح کراؤ' اور انصاف سے کام لو" ـــــ آیت کے اس حصے پر غور فرمائیے۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں واقعتاً گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور سر جھکانا پڑتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا' یہ اللہ ہی کا کلام ہے ـــــ یہاں بات دو اسلوبوں سے فرمائی گئی ہے: ﴿ بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ﴾ یعنی اب جو صلح کراؤ تو عدل کے ساتھ کراؤ اور دیکھو انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ یہ تکرار کیوں ہوئی؟ یہ اس لئے کہ جب ملت نے بحیثیت مجموعی ایک فریق کو صلح پر مجبور کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جذبات میں آکر اس فریق پر کوئی ناروا زیادتی ہو جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ دبانے کا رجحان پیدا ہو جائے' لہٰذا یہ خاص احتیاط کا مقام ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بطور سزا اس پر ایسی شرائط عائد کر دی جائیں جو نامناسب و ناروا ہوں اور جو زیادتی کے زمرے میں آتی ہوں۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا ہے کہ زیادتی کرنے والا فریق بھی آخر مسلمان ہی ہے' اہل ایمان ہی میں سے ہے' لہٰذا اب کہیں اس پر زیادتی نہ ہو جائے اور عدل و قسط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾ "جان رکھو کہ بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

صلح و مصالحت کی اصل بنیاد

اس کے بعد اگلی آیت میں ایک حتمی و قطعی ضابطہ اور سنہری اصول بیان فرما دیا گیا کہ مسلمانوں کے مابین معاملات اور تنازعات طے کراتے ہوئے جو روح کار فرما رہنی چاہئے' جو اہم ترین بات پیش نظر رکھنی چاہئے وہ کیا ہے! اس کی ان الفاظ مبارکہ میں تعلیم دی گئی اور تلقین فرمائی گئی ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ "یقیناً تمام مسلمان' تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" ﴿ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ ﴾ "لہٰذا اپنے بھائیوں کے مابین صلح' صفائی اور مصالحت کرا دیا کرو" ـــــ ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے سے فطرتِ انسانی کو اپیل کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے کہ دو بھائیوں کے مابین جھگڑے کو دیکھ کر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ دو بھائیوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھ کر ہر سلیم الفطرت انسان یہ چاہے گا کہ ان کے مابین صلح اور مصالحت کرائے۔ تو اسی فطرت کو اپیل کیا جا رہا ہے کہ مسلمان تو سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں' ان سب کا ایک دوسرے سے رشتہ اخوت ہے' لہٰذا اگر مسلمانوں کے مابین کہیں ایسا اختلاف ہو جایا کرے کہ جھگڑے اور لڑائی کی نوبت آ جائے تو اسی جذبے اور روح کے ساتھ جو بھائی بھائی ہونے کے ناطے تم میں ہونی لازمی ہے' ان کے مابین صلح کرانے کی کوشش کرو۔ آخر میں فرمایا: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ "اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اس کی نافرمانی سے بچتے رہو' اسی طرز عمل کے نتیجے میں تم امید کر سکتے ہو کہ تم پر رحم کیا جائے گا' تم پر رحمت خداوندی کا سایہ ہو گا۔"

ہمیں ان احکام کو اپنی گھریلو سطح پر' برادری کی سطح پر اور محلہ کی سطح پر پیش نظر رکھنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جلد وہ دن بھی لائے کہ پوری اُمت مسلمہ ایک وحدت کی شکل اختیار کر لے' ان کے آپس کے جھگڑے' تنازعات' اختلافات ختم ہو جائیں اور یہ بات صورتِ واقعہ اختیار کر لے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

یا جیسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ مسلمان قوموں کی ایک دولت

مشترکہ (Common Wealth) ہی وجود میں آجائے۔ پھر عجیب بات ہے کہ علامہ نے اس ضمن میں طہران کا تذکرہ کیا تھا کہ

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

اللہ تعالیٰ اگر ہمیں عالم اسلام کا ایک "کامن ویلتھ" قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے تو ہم اس بلند سطح پر بھی ان احکامِ قرآنیہ پر عمل کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

چھ معاشرتی و مجلسی برائیاں
اور ان سے باز رہنے کے تاکیدی احکام

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (الحجرات ۱۱، ۱۲)

"اے ایمان والو! تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ گروہ ان سے بہتر ہو۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق

اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی تم اپنے آپ کو عیب لگاؤ اور نہ ہی ایک دوسرے کے بُرے نام رکھو۔ ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔ اور جو اس سے باز نہیں آئے گا تو (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! کثرت سے گمان کرنے سے بچو' اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ٹوہ لگایا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ پس یہ بات تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے۔"

سورۃ الحجرات کے درس کے بارے میں تمہیدی گفتگو میں یہ بات عرض کی گئی تھی کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے اور آخری حصے میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی اور حیات ملی سے متعلق نہایت اہم اور اساسی و بنیادی باتیں زیر بحث آئی ہیں۔ درمیانی حصے میں مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور محبت و مودت کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے اور اختلاف و افتراق و عداوت کے سدباب کے لئے چند احکام دیئے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دو حکم بڑے ہیں اور چھ ان دو کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ میری اس بات سے کوئی غلط فہمی راہ نہ پائے' اس لئے جان لیجئے کہ قرآن مجید کی کوئی بات چھوٹی نہیں ہے' لیکن قرآن حکیم کی باتوں کے مابین ایک نسبت و تناسب ممکن ہے۔ چنانچہ اب ہم جن دو آیات (۱۱'۱۲) کا مطالعہ کر رہے ہیں' ان میں وہ چھ احکام بصورتِ نواہی آ رہے ہیں۔

ان چھ احکام کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مجلسی برائیاں ہیں جو ہمارے یہاں بہت عام ہیں اور انہیں عام طور پر حقیر اور بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے بسا اوقات باہم دل پھٹ جاتے ہیں' رشتہ محبت و مودت منقطع ہو جاتا ہے اور نفرت و کدورت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ہم امت مسلمہ کو ایک فصیل سے تشبیہ دیں تو ظاہر بات ہے کہ فصیل اینٹوں سے بنی ہوتی ہے اور فصیل کے مضبوط ہونے میں دو چیزیں فیصلہ کن ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ بھی خالص اور مضبوط ہو۔ ان دونوں میں سے ایک چیز بھی کمزور اور غیر خالص ہو گی تو اس کا نتیجہ فصیل کی کمزوری کی صورت میں نکلے گا۔ ہم نے قرآن کریم کی ان

آیات پر بھی غور کیا ہے جن میں نہایت تاکید کی گئی ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ہر ہر فرد کے سیرت و کردار کو پختہ کیا جائے۔ اور آج ہم ان آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے افراد' اشخاص' کنبوں' خاندانوں' قوموں اور قبیلوں کو جوڑنے والے مسالے کو مضبوط اور خالص رکھنے کے لئے جن چیزوں سے بچنا ضروری ہے' وہ ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

تمسخر و استہزاء سے گریز کا حکم

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ ـــــ ﴿ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ﴾ ـــــ اور ﴿ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ ﴾ ـــــ عام طور پر قرآن مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ صرف مَردوں سے خطاب کرکے ارشاد ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ احکام صرف مَردوں ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ عربی گرامر کا یہ قاعدہ ہے کہ خطاب میں بر سبیلِ تغلیب کسی ایک چیز کا ذکر کر دینے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسری چیز' جو اس کے تابع ہے وہ بھی مخاطب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر احکام صیغۂ مذکر میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس حکم کی خواتین کے لئے خاص طور پر تکرار آئی ہے۔ اس تکرار کی حکمت اور وجہ تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مجلسی خرابی مَردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ مَردوں کے سامنے زندگی کے بہت سے اہم ترین مسائل اور تلخ تر حقیقتیں رہتی ہیں اور ان میں ان کی مشغولیت رہتی ہے' جبکہ خواتین کا دائرہ عمل چونکہ بالعموم محدود رہتا ہے لہٰذا یہ باتیں ان میں زیادہ رواج پا جاتی ہیں۔ کسی کے لباس پر کوئی فقرہ چست کر دیا' کسی کی شکل و صورت کے بارے میں کوئی استہزائی انداز کا تبصرہ کر دیا۔ کسی کا رہن سہن اور چلن اگر فیشن کے مطابق نہیں ہے تو اس کا تمسخر اڑا دیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہم قرار دے کر ان پر اس طرح کی پھبتیاں چست کر دینا' ان پر استہزائی اور تمسخر کے انداز میں تبصرے کر دینا' عام طور پر عورتوں کی مجلسی زندگی میں یہ برائی زیادہ پائی جاتی ہے' لہٰذا اس کا یہاں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ خرابی مَردوں میں نہیں ہے۔ مَردوں میں بھی یہ برائیاں موجود ہیں' چنانچہ پہلے انہیں خطاب کیا گیا اور اس کے بعد اسے خواتین کے لئے دہرا دیا گیا۔

اب اگر آپ مزید غور کریں گے تو واضح ہو گا کہ باہم دوستوں میں بھی ایک دوسرے کا تمسخر و استہزاء بسا اوقات رنجش کا سبب بن جاتا ہے اور دوستیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مذاق کسی دوست سے دس مرتبہ کیا گیا اور وہ برداشت کر گیا' لیکن کسی وقت اس کا موڈ آف ہے تو ایسے میں ہو سکتا ہے کہ وہی مذاق اس کی برداشت سے باہر ہو جائے اور وہ پھٹ پڑے اور یہ پھٹ پڑنا ہو سکتا ہے کہ دیرینہ سے دیرینہ دوستی کے رشتے کو منقطع کرنے کا باعث بن جائے۔ یہ معاملہ خالص افراد کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور گروہوں' خاندانوں' کنبوں اور قبیلوں کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ پس پہلا حکم یہ دیا گیا کہ تمسخر اور استہزاء سے باز رہو۔

اب دیکھئے کہ اس میں اپیل کا ایک بڑا مؤثر انداز بھی موجود ہے' جس سے زیادہ مؤثر اسلوب ممکن نہیں ہے۔ مَردوں کے لئے فرمایا ﴿ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ ﴾ اور عورتوں کے لئے فرمایا ﴿ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ ﴾ تم جس کی ظاہری کمزوری یا عیب کو دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہو' اس پر فقرے چست کر رہے ہو' اس شخص کے متعلق تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں اللہ کی کتنی محبت ہو' اس کے دل میں محبت رسولؐ کا کتنا بڑا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اور اللہ کو تو قدر ان چیزوں کی ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں : ((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ)) "اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر ہے۔" لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ سیرت و کردار اور اللہ اور رسولؐ کی محبت و اطاعت اور فرمانبرداری میں تم سے کہیں آگے ہو' اللہ کے یہاں اس کا رتبہ بہت بلند ہو ـــــ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی جو شکل و صورت تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ پھر انؓ کا حال یہ تھا کہ عربی کے بعض تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ انؓ سے شین بالکل ادا نہیں ہوتا تھا۔ اذان میں وہ "اَسْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ' اَسْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ" کہا کرتے' لیکن انؓ کے دل میں اللہ تعالیٰ' آخرت اور رسالت پر جو ایمان تھا اور انؓ کے ریشے ریشے میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی جو شدید محبت رچی بسی تھی اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین' خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق

ﷺ ان ؓ سے سیدنا بلال ؓ کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ تو پہلی بات یہ سامنے آئی کہ کسی کا تمسخرواستہزاء نہ کرو' اور اس کے لئے نہایت مؤثر اپیل کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

عیب جوئی کی ممانعت

دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ : ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ "خود اپنے آپ کی عیب چینی نہ کیا کرو" جو تنگ نظر رکھنے والا انسان ہو گا' جس کا اپنا ظرف چھوٹا ہو گا' اس میں یہ بات نظر آئے گی کہ وہ دوسروں کے عیب تلاش کرے گا' عیب چینی کرے گا' عیب جوئی کرے گا' ان کی کسی برائی کو ان کے منہ پر دے مارے گا' دوسروں کی توہین کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لے گا۔ اب یہاں دیکھئے کہ کیسا پر تاثیر اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے : ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ کہ تم اگر کسی مسلمان کی عیب جوئی کر رہے ہو' اس پر عیب لگا رہے ہو' اس کے عیب ظاہر کر رہے ہو تو وہ تمہارا اپنا مسلمان بھائی ہے۔ گویا اس طرح تم نے خود اپنے آپ کو عیب لگایا ہے۔ اب اس سے زیادہ مؤثر اپیل کا انداز اور دلنشیں پیرایہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دیا کرو"۔ اس پر کسی نے عرض کیا کہ "کون شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا؟" حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا "اگر تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے اور وہ پلٹ کر تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا تو درحقیقت یہ تم نے خود اپنے والدین کو گالی دی"۔ اگر یہ بات دل کی گہرائی میں اتر جائے تو ﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ کی بلاغت و حکمت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

تحقیر آمیز ناموں سے پکارنے کی ممانعت

تیسرا حکم آیا ﴿ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ﴾ ایک دوسرے کے برے نام' چڑانے والے نام' تحقیر آمیز نام رکھ کر ان ناموں سے کسی کو مت پکارا کرو۔ ظاہر بات ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور اس کا ردِّعمل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کمزور ہو' احتجاج نہ کر سکے اور "قہرِ درویش برجانِ درویش" کے مصداق اسے اندر ہی اندر ضبط رہا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے جذبات مجروح نہیں ہوئے۔ یہی چیز وہ صورت اختیار کر سکتی ہے جیسے دو اینٹوں کے درمیان ان کو جوڑنے والا مسالہ

کمزور پڑ جائے اور اپنی جگہ چھوڑ دے تو یہ چیز دشمن کے اندر در آنے کا سبب بن سکتی ہے۔ للہذا فرمایا گیا کہ ایسے تمام رخنوں کو بند رکھنے کا اہتمام کرو۔ اس معاملہ میں احتیاط کا دامن تھامے رکھو۔

یہاں پھر دیکھئے کہ انتہائی مؤثر اور دلنشین پیرایۂ بیان اختیار فرمایا گیا ہے : ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ﴾ "ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔" جب اللہ نے تمہیں ایمان جیسی دولت عطا فرمائی' تمہیں جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف عطا فرمایا' تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور پستی کی طرف تمہارا یہ رجحان اس مقام سے مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

اس ترغیب کے ساتھ ہی اب ترہیب و تہدید اور دھمکی بھی ہے۔ ارشاد فرمایا : ﴿وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○﴾ "اور جو باز نہیں آئیں گے' رجوع نہیں کریں گے' اللہ کی جناب میں توبہ نہیں کریں گے تو جان لو کہ اللہ کے نزدیک ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔" یعنی ایسے لوگوں کو آخرت میں اپنے ایسے تمام افعال و اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ان کی سزا بھگتنی ہوگی' ان تمام چیزوں کو account for کرنا پڑے گا۔ یہ چیزیں ایسے ہی نہیں رہ جائیں گی جن کا حساب نہ لیا جائے۔

اگلی آیت میں پھر تین احکام بصورت نواہی آئے۔ قرآن مجید کا اعجاز بیان دیکھئے کہ ان چھ باتوں کو دو آیتوں میں تقسیم کیا' تین پہلی آیت میں اور تین دوسری آیت میں۔ لیکن پہلی آیت میں وہ تین باتیں آئی ہیں جو زود رنج ہوتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ طنز سامنے کیا جائے گا' طعنہ سامنے دیا جائے گا' تمسخر و استہزاء سامنے ہی کیا جائے گا' تب ہی تو اس سے لذت حاصل ہوگی۔ اسی طریقہ سے کسی کو برے نام سے پکارنے کا معاملہ بھی علی الاعلان ہوگا۔

بدگمانی سے بچنے کی تاکید

اگلی آیت میں ان تین برائیوں کا بیان آ رہا ہے جن کا اخفاء کے ساتھ یا پیٹھ پیچھے ارتکاب ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ "اے اہل ایمان' گمان کی کثرت سے بچو۔" یعنی خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں ایک گمان قائم کر لینا' کسی کے بارے میں خواہ مخواہ دل میں کوئی برا خیال بٹھا لینا' خواہ مخواہ کسی کے

بارے میں دل میں یہ رائے قائم کرلینا کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے' اسے مجھ سے کَد ہے' جبکہ اس کے لئے کوئی دلیل اور بنیاد موجود نہ ہو۔ اسی طرح خواہ مخواہ کسی کے بارے میں کسی اور اعتبار سے سوئے ظن قائم کرلینا' اس سے روکا گیا ہے۔ یہاں بھی اپیل کا انداز دیکھئے' ارشاد ہوا ﴿ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِ اِثْمٌ ﴾ "یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ تمہارا کوئی گمان درست ہو لیکن یہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ گمان تو گمان ہی ہے' علم تو نہیں ہے۔ لہٰذا تم نے بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی بنیاد کے کسی مسلمان بھائی کے بارے میں کوئی برا خیال اپنے دل میں بٹھالیا ہے' کوئی غلط رائے قائم کرلی ہے تو یہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی اور تمہیں اس پر سزا بھگتنی پڑے گی۔

تجسّس کی ممانعت

دوسری بات فرمائی ﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا ﴾ کسی کی ٹوہ میں رہنے اور تجسّس سے منع کیا جا رہا ہے —— جیسے مکھی بیٹھنے کے لئے گندگی تلاش کرتی ہے' ایسے ہی بعض پست ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا یہ ایک ذوق اور مشغلہ ہوتا ہے کہ اس ٹوہ میں لگے رہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ ان دو بھائیوں کے تعلقات ٹھیک ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ان دو دوستوں میں بڑا گہرا قلبی تعلق ہے' ایسا کیوں ہے؟ کہیں کوئی بات سامنے آئے جس سے ان کا کوئی اختلافی معاملہ ہمارے علم میں آجائے۔ اس تجسّس اور ٹوہ کے وطیرے سے روکا گیا۔ بلکہ احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ اگر تمہارے کسی بھائی کا کوئی عیب بغیر اس کے کہ تمہارا اس کو جاننے کا ارادہ تھا' تمہارے علم میں آجائے تو حتی الامکان اس کی پردہ پوشی کرو۔ اگر دنیا میں تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب کی پردہ پوشی کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری آخرت میں پردہ پوشی فرمائے گا۔ اس تلقین' اس تعلیم اور اس اخلاقی ہدایت کو سامنے رکھیں تو ایک مسلم معاشرے میں برکات ہی برکات نظر آئیں گی۔

غیبت کی شناعت

اس آیت میں تیسری اور آخری بات فرمائی: ﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً ﴾ "اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو۔" کسی کے پیٹھ پیچھے' کسی کی عدم موجودگی میں اس کی

برائی بیان کرنا غیبت ہے جبکہ نیت اس کی توہین و تذلیل کی ہو۔ یعنی اس کے بارے میں بری بات کو اس ارادے سے لوگوں تک پہنچانا اور پھیلانا تاکہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی وقعت نہ رہے۔ اسی آیت مبارکہ میں اس غیبت کی مذمت بڑے شدید انداز میں بیان ہوئی۔ ارشاد ہوا : ﴿ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا فَکَرِہۡتُمُوۡہُ ﴾ "کیا تم میں سے کوئی شخص اس کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، پس اسے تو تم بہت ناگوار سمجھتے ہو!" اب دیکھئے کہ اس میں مناسبت کیا ہے؟ جو شخص فوت ہو چکا ہے، وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اڑا لیں۔ اسی طرح جو شخص موجود نہیں ہے وہ اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی صفائی اور مدافعت میں کچھ کہہ نہیں سکتا، ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہو، ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں جو بات کہہ رہے ہیں وہ غلط ہو، اگر وہ موجود ہو گا تو وضاحت کر سکے گا، لیکن اگر وہ موجود نہیں ہے تو اپنی عزت کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے، جیسے ایک مردہ لاش اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے اپنے کسی غیر موجود مسلمان بھائی کی کوئی برائی بیان کی ہے تو یہ غیبت ہے اور درحقیقت یہ اخلاقی سطح پر بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی مردہ بھائی کی لاش سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں۔

چند استثناءات

البتہ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن میں کچھ استثناءات ہیں۔ بعض قرائن اور ظاہری شواہد کی بنیاد پر کسی کے متعلق بدگمانی دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہو گا کہ جلد از جلد اس کے متعلق اپنی استعداد کے مطابق تحقیق کر لی جائے۔ اسی طرح حکومت تفتیش اور صحیح صورتحال معلوم کرنے کے لئے تجسس کر سکتی ہے۔ وہ یہ جاننے کے لئے تجسس کا ایک مستقل شعبہ اور محکمہ قائم کر سکتی ہے کہ ملک میں غیر ملک کے جاسوس تو سرگرم عمل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی دوسرے ممالک میں جاسوسی کا کوئی نظام قائم کرے تو یہ غلط نہ ہو گا، کیونکہ اس مقصد کے پیچھے ملک کی سلامتی کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ کسی خاندان میں آپ اپنی اولاد کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں، یا کسی خاندان سے آپ کے بیٹے بیٹی کے لئے رشتہ آیا ہے تو آپ صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے تجسس یا بالفاظِ دیگر تحقیق و تفتیش کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اس نیت اور ارادے کے بغیر کہ اپنے کسی بھائی کی عزت پر حملہ کرنا مقصود ہو' اگر کسی مسلمان کی کوئی برائی بیان کرنے کی ناگزیر ضرورت پیش آجائے تو اس کا شمار غیبت میں نہیں ہو گا۔ مثلاً حضورؐ نے فرمایا کہ اگر آپ کے کسی بھائی کا کہیں رشتہ طے پا رہا ہے اور وہاں کی کوئی غیر مناسب بات آپ کے علم میں ہے اور آپ اپنے اس دینی بھائی کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت اسے وہ بات بتا رہے ہیں تو یہ غیبت شمار نہیں ہو گی۔ مزید بر آں جہاں واقعتاً کوئی تمدنی ضرورت ہو تو کسی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی بری بات کو' جو فی الواقع اس میں ہو' بیان کر دینا غیبت کی تعریف سے خارج ہو جائیگا۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ "اور (ہر حال میں) اللہ کی نافرمانی سے بچو (اگر خطا ہو جائے تو اس کے حضور میں توبہ کرو)۔ یقیناً اللہ نہایت معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔" کسی بندۂ مومن سے خطا ہو جائے تو اس کے لئے صحیح ترین رویہ یہ ہے کہ وہ اس پر پشیمانی کا اظہار کرے اور اللہ کی جناب میں رجوع کرے اور اس سے توبہ اور معافی کا طالب ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کو نہایت معاف فرمانے والا' توبہ قبول فرمانے والا اور رحم فرمانے والا پائے گا۔

بہر حال ان دو آیات میں چھ نواہی بیان ہوئے۔ تمسخر و استہزاء سے بچنا' عیب جوئی اور عیب چینی سے بچنا' ایک دوسرے کے برے نام رکھنے سے بچنا' سوئے ظن سے اجتناب کرنا' تجسس اور غیبت سے بچنا۔ اگر ان نواہی کو ملحوظ رکھا جائے تو ایک مسلم معاشرے میں افراد کو ایک دوسرے سے کاٹنے یا گروہوں' خاندانوں اور کنبوں کے درمیان رشتہ محبت اور اخوت و مودت کو منقطع کرنے کے لئے جو رخنے پیدا ہو سکتے ہیں' ان سب کا سدِّباب ہو جائے گا۔

﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾
(آیت ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل میں تقسیم کیا تاکہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے

نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور
پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا ہے (اور) باخبر ہے۔"

آپ کو یاد ہو گا کہ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ' خواہ وہ ریاست کی صورت میں ہو خواہ معاشرہ کی شکل میں ہو' اس کی دو اساسات کا ذکر تھا ـــــ ایک دستوری اور قانونی اساس کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر رہو' اس سے تجاوز نہ کرو ـــــ اور دوسری ایک قلبی اور جذباتی بنیاد' یعنی آنحضور ﷺ کی مرکزی شخصیت سے مضبوط تعلق خاطر' آپؐ سے انتہائی درجے کی قلبی محبت' آپؐ کا ادب و احترام اور آپؐ پر بحیثیت رسول پختہ ایمان۔ اس آخری حصے میں انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق پھر نہایت اہم باتیں سامنے آ رہی ہیں۔

مساواتِ انسانی کی دو بنیادیں

اب جو آیت زیر مطالعہ ہے اس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات نوٹ کیجئے کہ یہاں خطاب کا انداز بدل گیا۔ یعنی ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ کی بجائے ﴿ یٰاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ آیا' جبکہ اس سے پہلے اس سورہ میں پانچ مرتبہ خطاب کے لئے یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں خطاب صرف اہل ایمان سے تھا۔ یہاں جو خطاب کے الفاظ بدل گئے ہیں تو وہ یوں نہیں بدلے' بلکہ اس لئے بدلے ہیں کہ اس آیت کا جو مضمون ہے وہ ایک آفاقی حقیقت (Universal Truth) اور تمام انسانوں کے مابین ایک قدر مشترک ہے' اس سے قطع نظر کہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ہوں' گورے ہوں یا کالے ہوں' مسلمان ہوں یا یہودی' عیسائی' بدھ' سکھ اور پارسی ہوں' یا مشرک اور دہریئے ہوں۔ دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان دو چیزیں مشترک ہیں جنہیں اس آیۂ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ خطاب فرمایا گیا ﴿ یٰاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ یعنی "اے بنی نوع انسان ـــــ اے لوگو! اب وہ دو مشترک چیزیں بیان فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی چیز ہے ﴿ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ ﴾ "ہم نے تم سب کو پیدا کیا" ـــــ بنی نوع انسان کے دو یا چار خالق نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گوروں کو پیدا کرنے والا کوئی گورا خدا ہو اور کالوں کا خالق کوئی کالا خدا ہو۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ایسا بھی نہیں کہ مشرق کے رہنے والوں کا خالق کوئی اور ہو اور مغرب والوں کو پیدا کرنے والا کوئی اور ہو۔ ﴿ لِلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَ الۡمَغۡرِبُ ﴾

مشرق و مغرب سب کا اللہ ہی مالک ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلمان کا خالق کوئی اور خدا ہو اور غیر مسلم کا خالق کوئی اور خدا ہو' بلکہ سب کا خالق صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ جیسا کہ ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں کہ: ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ﴾ "وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا' پھر تم میں کوئی کافر ہے اور کوئی تم میں مومن ہے" ــــ یوں سمجھئے کہ یہاں وحدتِ خالق اور وحدتِ الٰہ بیان ہوئی۔ یہ وہ مشترک قدر ہے جو تمام نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے : ﴿ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ "ہم نے تم سب کو پیدا کیا" یہ پہلی قدرِ مشترک کا بیان ہوا۔

دوسری قدرِ مشترک کیا ہے! وہ ہے: ﴿ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى ﴾ ــــ "ایک مرد اور ایک عورت سے۔" یہ وحدتِ آدم اور وحدتِ حوّا کا ذکر ہوا۔ تمہاری نسلیں کتنی ہی مختلف ہیں' تمہاری رنگتیں کتنی ہی جدا ہیں' تمہارے نقوش' تمہاری شکلیں' تمہاری شباہتیں کتنی ہی مختلف ہیں' تمہاری زبانیں کتنی ہی جدا ہیں' لیکن تم سب اصل میں ایک ہی نسل ہو' تم سب کے سب آدم اور حوّا کی اولاد ہو۔ پس یہ دو مشترک قدریں ہیں جو تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ یہ دو چیزیں وہ ہیں جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں' لہٰذا یہاں خطاب ﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ سے ہوا۔

قوموں اور قبیلوں کی تقسیم تعارف کے لئے ہے

اس کے بعد ایک بڑی اہم حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ قوموں اور قبیلوں کی جو تقسیم بالفعل موجود ہے وہ بھی ہماری پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ تقسیم بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر بڑا افراط و تفریط کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کبھی جوش میں آ کر اس تقسیم و تفریق کی بالکل نفی کر دیتے ہیں' جبکہ قرآنِ مجید اس کو تسلیم کر رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قومی خصائص بھی ہوتے ہیں' قبیلوں کی بھی اپنی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں واقعی اور فطری ہیں۔ زبانوں کا فرق ہے تو وہ حقیقی ہے۔ اسی طرح شکل و شباہت کا فرق ہے' چہروں کے نقوش جدا ہیں' رنگتوں میں فرق ہے۔ کوئی گورا ہے' کوئی کالا ہے' کوئی گندمی اور زرد رُو ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ چینی ہے یا حبشی ہے۔ وقِس علیٰ ھذا ــــ اس شخص سے کوئی بات نہیں ہوئی' اس سے آپ

نے کچھ پوچھا نہیں اور صرف ظاہری رنگ اور نقوش سے پہچانتے ہی آپ نے اس کا سارا جغرافیائی پس منظر بھی جان لیا اور اس کا پورا تاریخی پس منظر بھی آپ کو معلوم ہوگیا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت تعارف اور پہچان کے لئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ ﴾ "اور ہم نے بنائیں تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو" ـــــ آپ خود سوچئے کہ اگر تمام انسان ایک رنگت کے ہوتے' تمام انسانوں کے نقوش ایک جیسے ہوتے۔ تو کتنی یکسانیت (monotony) ہوتی اور یہ کس قدر اکتاہٹ والی (boring) کیفیت اور کتنی بیزار کن صورت ہوتی۔ اس اختلاف اور فرق وتفاوت میں حسن ہے ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

تو اس تقسیم و تفریق اور اختلاف میں جو بہتری کا پہلو ہے اسے سامنے رکھا جانا چاہیئے۔ ورنہ سوچئے کہ کتنا پریشان کن معاملہ ہوتا اور کیسے پہچانتے کہ یہ کون ہے! بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جڑواں اور ہم شکل بھائیوں یا بہنوں کے معاملے میں بڑے مغالطے ہوتے ہیں اور بہت سے لطیفے وجود میں آتے ہیں۔ ان کے مابین تمیز و امتیاز بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ فرق وتفاوت اور یہ اختلاف و امتیاز بالکل فطری (natural) ہے اور اس کا ایک مقصد ہے۔ اس کا ایک بڑا تمدنی فائدہ یہ ہے کہ ﴿ لِتَعَارَفُوْا ﴾ "تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔" اس کی نفی کرنا اسلام کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

عزّت و شرف کی واحد بنیاد : تقویٰ

رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ کا تصور قائم کرنا کہ فلاں نسل اعلیٰ ہے اور فلاں ادنیٰ' نوعِ انسانی کا فلاں طبقہ بڑھیا ہے اور فلاں گھٹیا ـــــ یہ بالکل غلط نظریہ اور سراسر غلط تصور ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان فساد' نفرت اور عداوت پیدا کرنے والا تصور و نظریہ ہے۔ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم اس فطری فرق وتفاوت کا بالکل غلط استعمال ہے' جسے قرآن حکیم صحیح تسلیم کر رہا ہے کہ : ﴿ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ﴾ "اور ہم نے تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنائے تاکہ تم باہم ایک دوسرے کو پہچانو۔" ـــــ لیکن ایک بنائے شرف اور بنائے عزت بھی اللہ نے رکھی ہے : ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ

﴿ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾ ــــ جان لو کہ اللہ کے نزدیک تو تمہارے مابین اونچ نیچ کا معاملہ صرف ایک بنیاد پر ہے اور وہ بنیاد رنگ نہیں ہے' خون نہیں ہے' نسل نہیں ہے' وطن نہیں ہے' زبان نہیں ہے' شکل و صورت نہیں ہے' قومیت نہیں ہے' بلکہ وہ واحد بنیاد ہے تقویٰ' خدا ترسی' پرہیزگاری' نیکوکاری' اعلیٰ سیرت و کردار' اعلیٰ اخلاق اور احسن معاملات۔ اللہ کے نزدیک کوئی اونچا ہے تو ان اوصاف کی بنیاد پر اور کوئی نیچا ہے تو ان کے فقدان کی بناء پر۔ اونچ نیچ اور شرافت و رذالت کے لئے اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔

اب اس آیت کے آخری حصّے پر نگاہوں کو مرتکز کیجئے۔ فرمایا جارہا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے' باخبر ہے۔" ــــ ان الفاظ کے ذریعہ سے اس حقیقت کو واضح کردیا گیا کہ تقویٰ تو اگرچہ دل میں ہوتا ہے اور کوئی انسان کسی دوسرے کے دل کو چیر کر نہیں دیکھ سکتا لیکن اللہ تو باخبر ہے کہ کسی کے دل میں کتنا تقویٰ ہے۔ کوئی شخص بہروپیا ہو' متقیوں جیسی صورت و شکل بنالے اور لباس پہن لے' نیز محض ریاء و سمعہ کے لئے ظاہری طور پر خوش خلقی اور حسنِ سیرت و کردار کا پیکر بنا پھرے اور اس طرح دنیا میں اپنا کوئی رعب گانٹھ بھی لے' لیکن وہ اللہ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اللہ علیم ہے' خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے! کون واقعتاً خدا ترس ہے اور کون صرف دکھاوے کے لئے متقی بنا ہوا ہے! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا ((خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ)) یعنی اصل تقویٰ وہ ہے جو خلوت میں بھی ہو جلوت میں بھی ہو۔ اگر اس کے برعکس صورت یہ ہو کہ ؏ "چوں بخلوت می رود در کارِ دیگری کند" تو پھر یہ بہروپ ہے' تقویٰ نہیں ہے۔ پس اگر تمہارا اپنے رب کے ساتھ تعلق ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ رب تو علیم ہے' خبیر ہے اور اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے اور ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ "اگر تم اپنے جی کی بات ظاہر کرو گے' یا اس کو چھپاؤ گے' اس کا وہ (اللہ) تم سے حساب لے لے گا۔"

زیرِ مطالعہ آیتِ مبارکہ کے دو رُخ

اب اس پوری آیت کے بارے میں یہ بات نوٹ کیجئے کہ اس کے دو رخ ہیں۔ ایک

رخ تو اس مضمون کی طرف ہے جو پچھلے سبق میں آچکا ہے کہ استہزاء اور تمسخر نہ کرو' کسی کا مذاق نہ اڑاؤ' فقرے چست نہ کرو' کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو' کسی کے برے نام نہ رکھو' کسی کی ٹوہ میں نہ لگو' خواہ مخواہ کسی کی بدگمانی سے بچو' کسی کی غیبت نہ کرو' بلکہ مطلوب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں باہمی اخوت ہو' محبت ہو' ہمدردی اور دمسازی ہو۔ تو اس کے لئے جو اصول اس آیت میں سامنے آیا وہ بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے ـــــ دیکھئے! حقارت کیوں ہوتی ہے؟ اپنے آپ کو بڑھیا سمجھنے کی وجہ سے۔ کوئی اپنے آپ کو اعلیٰ نسل کا سمجھتا ہے تو وہ ہر دوسرے کو ادنیٰ نسل کا سمجھے گا۔ اگر کسی کو اپنے کسی خلقی وصف' جیسے رنگت یا اچھی شکل و صورت پر' کوئی غرور پیدا ہو رہا ہے تو وہ ان کی بناء پر دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا اور ان کا تمسخر و استہزا کرے گا' حالانکہ یہ تمام چیزیں اختیاری نہیں ہیں' یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ـــــ لہٰذا اس آیت میں اس اصل مرض کی جڑ کاٹ دی گئی' غرور کی علت پر تیشہ چلا دیا گیا کہ میں بڑا ہوں' میں اعلیٰ ہوں' میں اونچا ہوں۔ یہی وہ پندار ہے جو دوسرے کو حقیر اور ادنیٰ سمجھنے اور اس کا استہزا و تمسخر کرنے پر ایک دنی الطبع شخص کو آمادہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ حقیقت بیان کر دی گئی کہ تمام انسان' انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں۔ ان کا خالق بھی ایک اور ان کا جدِّ امجد بھی ایک ہے۔

اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں بایں الفاظ فرمایا تھا :

((لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ فَضْلٌ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰى ـــــ كُلُّكُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت ہے' اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تخلیق ہوئے تھے۔"

اس آیت مبارکہ کا دوسرا رُخ اس اعتبار سے کہ آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر دنیا میں انسانوں کی تقسیم دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک افقی (Horizontal) تقسیم ہے

اور ایک عمودی (Vertical) تقسیم ہے۔ افقی تقسیم یہ ہے کہ کوئی اونچا ہے' کوئی اس سے بھی اونچا ہے' کوئی اعلیٰ ہے' کوئی ادنیٰ ہے۔ یہ تو ہے درجوں کا تفاوت۔ اور عمودی تقسیم جس سے معاشرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ (isolate) ہوتے ہیں' وہ یہ ہے کہ یہ اور سوسائٹی ہے' وہ اور سوسائٹی۔ یہ جرمن سوسائٹی ہے' وہ انگلش سوسائٹی۔ یہ فلاں ریاست ہے اور وہ فلاں ریاست۔ یہ فلاں قومیت ہے' وہ فلاں قومیت ——— تو یہ دو تقسیمیں ہیں۔ دنیا میں عام طور پر پہلی تقسیم نسل' رنگ' خون اور وطن کی بنیاد پر ہے۔ اسلام نے اس کی بالکلیہ جڑ کاٹ دی کہ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ وادنیٰ کی رنگ' نسل' خون اور وطن کی بنیاد پر تقسیم اپنی اصل کے اعتبار سے فساد ہے' فتنہ ہے' انسانیت کی توہین و تذلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف و عزت اور اکرام و اعزاز کا معیار اعلیٰ سیرت و کردار' حسن اخلاق' حسن معاملات' نکوکاری' پرہیزگاری اور خدا ترسی یعنی تقویٰ ہے۔

اب ہے دوسری عمودی تقسیم ——— اور یہ تقسیم اسلام بھی کرتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ کا بہرحال ایک غیر اسلامی معاشرے سے علیحدہ تشخص ہے۔ ایک اسلامی ریاست ممیز (demarcate) ہوتی ہے ایک غیر اسلامی ریاست سے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ عمودی تقسیم کس بنیاد پر ہے؟ تو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس تقسیم کی بنیاد نہ نسل ہے' نہ رنگ ہے' نہ خون ہے' نہ قوم و وطن ہے اور نہ ہی زبان ہے۔ یہ بنیاد ہے نظریہ' عقیدہ' خیالات اور اصول ——— یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننے والے ہیں' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہ بعث بعد الموت' حشر و نشر' جنت و دوزخ اور محاسبۂ اخروی کو ان تفاصیل کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں جن کی خبر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں' اور جن کی خبر دی ہے نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات و فرموداتِ گرامی میں ——— اسلام کی اصطلاح میں اس تسلیم و یقین کا نام ایمان ہے۔

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ اسلام نے اس چیز کی کلی نفی کر دی جو افقی (Horizontal) اور عمودی (Vertical)' دونوں سطحوں پر نوعِ انسانی کو تقسیم کر رہی تھی۔ اسلام میں جو افقی تقسیم ہے وہ ہے تقویٰ یعنی نکوکاری' خدا ترسی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر ——— اور عمودی تقسیم یعنی اسلامی معاشرہ کا غیر اسلامی معاشرہ سے علیحدہ اور ممیز ہونا' وہ ہوگا نظریہ و عقیدہ یعنی ایمان کی بنیاد پر۔

پھر یہ بات پیش نظر رکھئے کہ کوئی انسان اپنی چمڑی کی رنگت بدل نہیں سکتا۔ وہ چاہے سو برس سے امریکہ میں رہ رہا ہو' وہ کالا ہی ہے۔ لہٰذا ایک ملک میں رہنے کے باوجود کالوں کا معاشرہ علیحدہ ہو گا' گوروں کا معاشرہ علیحدہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص انگلش نسل سے ہے تو وہ جرمن نسل کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ حدود تو وہ ہیں جن کو انسان cross نہیں کر سکتا' ان کو پھلانگ نہیں سکتا۔ یہ رکاوٹیں (barriers) مستقل ہیں۔ جبکہ نظریے اور خیالات کے barriers تو آناً فاناً ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کوئی شخص کلمہ شہادت ادا کرتا ہے تو فی الفور وہ مسلمان معاشرے کا باعزت فرد بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو خواہ ہندو سوسائٹی میں شودر ہو' اچھوت ہو' جس کا ہندو معاشرے کے اندر سڑک کے درمیان سے گزرنا بھی ممنوع ہو' اور اس کے کانوں میں اگر وید کے اشلوک پڑ جائیں چاہے اس کی نادانستگی میں پڑے ہوں تو ہندو دھرم کی رو سے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالنا لازم ہو جائے۔ لیکن آج اگر وہ کلمہ پڑھ لے تو وہ سید زادے کے ساتھ' شیخ الاسلام کے ساتھ' بڑے سے بڑے مسلمان کے ساتھ بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر مسجد میں نماز میں کھڑا ہو جاتا ہے' اور یہ نو مسلم ہر مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھا سکتا ہے اور ایک ہی برتن سے پانی پی سکتا ہے' جبکہ پیدائشی شودر ہندو دھرم میں ہمیشہ ہمیش کے لئے اچھوت اور ناپاک ہی رہتا ہے چاہے وہ تعلیم میں' کردار میں' اخلاق میں پیدائشی برہمن سے کتنا ہی ترقی یافتہ ہو ـــــ ایمان کی تقسیم وہ نہیں ہے کہ جو مستقل بالذات ہو۔ یہ تقسیم تو وہ ہے کہ انسان جب چاہے اس رکاوٹ (barrier) کو عبور کرے اور اسلامی معاشرے میں شامل ہو جائے۔

ایک عالمی ریاست کا قیام : وقت کی اہم ضرورت

اس سلسلے میں ایک اہم بات میں یہ عرض کروں گا کہ اس آیت مبارکہ کی جدید دنیا کے اعتبار سے خاص اہمیت ہے۔ دیکھئے جدید دنیا میں بین الاقوامی اور عالمی سطح پر ایک عجیب dilemma' ایک عقدۂ لاینحل پیدا ہو گیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے فاصلے قریباً ختم کر دیئے ہیں۔ اب پوری دنیا کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی زمانہ میں ایک شہر ہوتا تھا اور اس کے محلے ہوتے تھے۔ ذرائع ابلاغ و مواصلات اتنے ترقی کر گئے ہیں کہ فاصلے قریباً معدوم کے درجے میں آ گئے ہیں۔ کوئی واقعہ امریکہ میں ہو رہا ہوا سے آپ ٹیلی ویژن پر براہ راست یہاں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن

ظاہر اور خارج میں یہ فاصلے اتنے کم ہو جانے کے باوصف دلوں کے فاصلوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دل پھٹے ہوئے ہیں۔ کوئی قدر مشترک موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ میں رہنے والا کالا اور گورا علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کے دلوں کو جوڑنے والا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید دور کی مادیت اور الحاد نے یہ دونوں بنیادیں منہدم کر دی ہیں۔ نہ وحدتِ خالق و الٰہ باقی رہی' نہ وحدتِ آدم و حوّا باقی رہی۔ کوئی تیسری چیز ہے ہی نہیں جو انہیں جوڑ سکے۔ ایک انگریز کو ایک جرمن کے ساتھ کون سی چیز جوڑے؟ ایک چینی کو روسی کے ساتھ کون سی چیز ہے جو جوڑ سکے؟ ایک جاپانی اور ایک ماریطانیہ کے رہنے والے کے مابین کون سی قدر مشترک ہے جو ان کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکے؟ یہ ہے وہ dilemma جس سے آج کی دنیا دوچار ہے' جبکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک وحدت بنے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی شدید ضرورت ہے کہ نیشنل سٹیٹس ختم ہو جائیں اور ایک عالمی سٹیٹ قائم ہو۔ ورنہ نوعِ انسانی ہلاکت کے سخت خطرے سے دوچار ہے۔ اگر کہیں حادثاتی طور پر عالمی جنگ شروع ہو گئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا انجام ہو گا! شاید یہ نوعِ انسانی کی اجتماعی خودکشی بن جائے۔ لیکن اس خطرے کے ادراک و شعور اور اس کے تدارک کے احساس کے باوجود دلوں کو قریب لانے والی انسان کی اپنی سوچ کسی مضبوط' پائیدار اور ٹھوس بنیاد تلاش اور فراہم کرنے میں تاحال ناکام و قاصر رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد پہلا تجربہ لیگ آف نیشنز کا کیا گیا اور وہ ناکام ہوا۔ اس لئے کہ جب فکر میں کوئی بنیاد نہیں' دلوں میں جگہ نہیں تو محض ساتھ بیٹھنے اور اپنے اپنے مفادات کی راگنی راگنے اور ان کے تحفظات کیلئے جائز و ناجائز طور پر اس نام نہاد عالمی ادارے کو استعمال کرنے سے مسائل تو حل نہیں ہو جائیں گے' بلکہ وہ تو مزید الجھیں گے اور ان کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خطرناک نکلیں گے' جیسا کہ بیس برس بعد ہی دوسری عظیم ترین جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کی صورت میں نکلے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے!

لیگ آف نیشنز کی ناکامی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تنظیم اقوام متحدہ (U N O) اور اس کی قائم کردہ سلامتی کونسل کا جو تجربہ ہوا ہے' وہ بھی لیگ آف نیشنز سے بہتر ہونے کے بجائے اس سے کہیں زیادہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ اسرائیل اور چند دوسرے ممالک جس طریقے سے ان اداروں کے متفقہ فیصلوں کو بھی defy کرتے ہیں اور ٹھوکر مار دیتے ہیں' ان سے پوچھنے اور ان کے خلاف کوئی مؤثر اقدام کرنے کے لئے نہ سلامتی کونسل آمادہ ہے اور نہ UNO کا پورا

ادارہ ـــــ عالمی سطح پر جو ناکامیاں (failures) ہیں اور جو پیچیدگیاں ہیں' ان کا سبب یہی ہے کہ وہ فکر موجود نہیں ہے جو انسان کو انسان کے قریب لاسکے۔ نوعِ انسانی کی یہی ضرورت ہے جو یہ آیت مبارکہ پوری کررہی ہے : ﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ...﴾

اب میں کیا مرثیہ کہوں اور کیا ماتم کروں کہ جن کے پاس یہ دولت ہے' ان کے اپنے افلاس کا حال یہ ہے کہ وہ خود ہی منقسم ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

یوں تو سیّد بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو' بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

ہم پر مغربی استعمار کا جو سب سے بڑا کاری وار ہوا ہے وہ یہ ہے کہ علاقائی نیشنلزم کے ہلاکت خیز جراثیم انہوں نے ہمارے اندر بھی پیدا کردیئے۔ مثال کے طور پر عربوں کے حالِ زار پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ ویسٹرن امپیریلزم نے عربوں میں علاقائی اور وطنی زہر کے جرثومے اس طور پر inject کئے ہیں کہ مصریوں کے لئے اب یہ بات بنائے فخر ہے کہ وہ مصری ہیں' شامیوں کے لئے بنائے فخریہ نعرہ بن گیا کہ وہ شامی ہیں۔ یہی حال عراق' سعودی عرب اور یمن کا ہے۔ وقِس علیٰ ھذا ـــــ ایک قوم' ایک زبان بولنے والے' اکثر و بیشتر نسل ایک' عظیم ترین اکثریت کا دین ایک' لیکن علاقائی نیشنلزم (Territorial Nationalism) کی جو تنگ گھاٹیاں بنا کر یورپی استعمار نے ان کو چھوڑا تھا تو وہ اس سے نکل نہیں پارہے۔ اور یہی ہماری ذلت و رسوائی اور نکبت و مسکنت کا اصل سبب ہے۔ کاش! ہم مسلمان خود اپنے معالجہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس آیت مبارکہ کو اپنے لئے روشنی کا ایک مینار بنالیں۔ پہلے ہم خود وحدتِ الٰہ و وحدت آدم یعنی وحدت انسانی کی بنیاد پر ایک ملت بن جائیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

ہم اگر دنیا کو یہ نقشہ دکھلادیں تو بقیہ نوعِ انسانی کو بھی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

'اسلام' اور 'ایمان' میں فرق وتفاوت

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ ﴾

"یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ تاہم اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہوگے تو اللہ تمہارے اعمال (کے اجر وثواب) میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔"

یہ بات نوٹ فرمالیجئے کہ ایک خاص مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے' اور وہ خاص مضمون ہے ایمان اور اسلام کا فرق۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر "ایمان و اسلام" اور "مؤمن و مسلم" ہم معنی اور مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جو کوئی مؤمن ہے وہ مسلمان ہے اور جو کوئی مسلمان ہے وہ مؤمن ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انگریزی میں ہم کہتے ہیں :

Call the rose by any name, it will smell as sweet

اس لئے کہ ایمان ایک باطنی کیفیت ہے جبکہ اسلام اس کا عالم واقعہ میں ظہور ہے۔ اب جس شخص میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں' دل میں ایمان بھی ہے' عمل میں اسلام بھی ہے' اسے آپ چاہے مؤمن کہیں' چاہے مسلم کہہ لیں' کوئی فرق نہیں واقع ہوگا۔ لیکن یہاں آپ نے الفاظِ قرآنی اور ان کا ترجمہ ملاحظہ کیا کہ اس آیۂ مبارکہ میں ان دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل لایا گیا ہے اور ایک معین گروہ کے دعوائے ایمان کی پرزور نفی کی گئی ہے۔ "لَمْ تُؤْمِنُوْا" میں میں نہایت مؤکد نفی ہے' اسی لئے میں نے ترجمہ میں لفظ "ہرگز" کا اضافہ کیا ہے کہ "تم ہرگز ایمان نہیں لائے" ـــــ عربی زبان میں فعل ماضی میں نفی پیدا

کرنے کے لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی ہی پر "ما" کا اضافہ ہو جائے، جیسے مَا اٰمَنْتُمْ "تم ایمان نہیں لائے ہو"۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ فعل مضارع پر "لَمْ" داخل کیا جائے۔ یہ تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ لَمْ تُؤْمِنُوْا "تم ہرگز ایمان نہیں لائے"۔ بات مکمل تھی، لیکن اسے یہ فرما کر مزید مؤکد کیا گیا: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ "اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"۔ وہ تو صرف تمہاری زبانوں پر ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایمان کی تو نہایت مؤکد، نہایت تاکیدی اسلوب سے نفی ہو گئی، بایں ہمہ ان کا اسلام تسلیم کیا جا رہا ہے: ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا...﴾ "البتہ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (ہم مسلمان ہو گئے ہیں، ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے"۔ اس لئے کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں to give up resistance اور to surrernder۔ یعنی مقابلہ و مقاومت اور مخالفت و مزاحمت چھوڑ کر سر تسلیم خم کر دینا۔ اسے فارسی میں کہا جائے گا "گردن نہادن"۔ تو فرمایا گیا کہ یہ بدو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے۔

آگے فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ یعنی اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر کاربند رہو گے تو تمہارے اعمال قبول کر لئے جائیں گے، ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ تمہارا اسلام تسلیم ہے، لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ایمان لے آئے ہو تو یہ تمہارا بڑا مغالطہ ہے، اس کی تصحیح کر لو۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ "یقیناً اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے"۔ یعنی یہ جو رعایت دی جا رہی ہے کہ قلبی ایمان کے بغیر تمہارے اسلام اور تمہاری اطاعت کو قبول کرنے اور تمہاری مغفرت کرنے، تم پر رحم فرمانے کی بشارت دی جا رہی ہے، وہ اس کی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل ہے۔ اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

آیہ مبارکہ کی تاویل خاص

اب ہم ذرا دو پہلوؤں سے اس آیت پر غور کریں گے۔ پہلے تو ہم اس پہلو سے اس آیت مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جسے تاویل خاص کہتے ہیں، یعنی قرآن مجید کے زمانۂ نزول اور اس آیت کے پس منظر کے حوالے سے سمجھا جائے کہ وہ کون لوگ تھے

جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اس بات کی تفہیم کے لئے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جو مختلف ادوار ہیں' ذرا ان کو ذہن میں لایئے۔ جب تک حضور ﷺ مکہ میں تشریف فرما رہے' سب کو معلوم ہے کہ مسلمان کمزور تھے' کفر کا غلبہ تھا۔ جو شخص اسلام قبول کرتا تھا اسے ستایا جاتا تھا' طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اور ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ لہٰذا صرف وہی شخص زبان پر کلمۂ شہادت لاتا تھا جس کے دل میں یقین کامل پیدا ہو چکا ہوتا تھا ـــــ اتنا پختہ یقین کہ وہ اس کلمۂ حق کی ادائیگی پر اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوتا تھا ـــــ اتنا گہرا یقین کہ وہ اس کلمۂ شہادت کو ادا کرنے پر دنیا کی ہر شے کو تج دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوتا تھا۔ جب اس درجے میں اس کے دل میں اللہ پر' اس کی توحید پر' حضور ﷺ کی نبوت و رسالت پر اور بعث بعد الموت' حشر و نشر' جزا و سزا پر ایمان جاگزیں ہو جاتا تھا تب وہ کہتا تھا : اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ـــــ یعنی وہاں ایمان پہلے تھا اور اسلام بعد میں آیا۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے تب حالات بدل گئے۔ اب اسلام کے غلبے کا دَور شروع ہوا۔ یثرب جو بعد میں مدینۃ النبی بنا' پہلے ایک ''شہری ریاست'' تھی' پھر یہاں اسلام کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا جیسے جیسے حالات بدلتے چلے گئے اور اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ویسے ویسے مکی دَور والی کیفیت بھی بدلتی چلی گئی۔ اب ان مصائب و شدائد سے سابقہ پیش آنا ختم ہو گیا جن کا سلسلہ مکّہ میں بارہ تیرہ سال جاری رہا تھا۔ اس تبدیل شدہ صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ کچے پکے لوگ بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اب چونکہ کسی تشدد اور جور و تعدی کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا' لہٰذا لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اَوس و خزرج کے پورے کے پورے قبیلے ایمان لے آئے۔ ظاہر بات ہے کہ چشم زدن میں ان کے دلوں میں حقیقی ایمان جاگزیں نہیں ہو جاتا تھا' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی ایک جماعت کا ظہور ہونا شروع ہوا۔

پھر فتح مکہ کے بعد صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ اب تو گویا عرب میں سب سے بڑی طاقت رسول اللہ ﷺ کی تھی۔ جب قریش شکست کھا چکے اور طائف کے دو مضبوط قبائل ہوازن اور ثقیف بھی مغلوب ہو گئے تو اب عرب میں اور کون تھا جو جناب محمدؐ رسول اللہ

ﷺ کے مدِّ مقابل آنا۔ لہٰذا تمام قبائل عرب میں ایک رو چلی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ طے کیا کہ نبی اکرم ﷺ سے مقابلہ کرنے اور آپؐ کی مزاحمت کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے' اب ہم آپ ﷺ کی پیش قدمی میں مزاحم نہیں ہو سکتے' لہٰذا خود ہی مدینہ چلیں اور محمد ﷺ کی اطاعت قبول کر لیں —— یہ ہے وہ نقشہ جو آخری پارے کی سورۃ النصر میں آتا ہے کہ : ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ ﴾ کبھی یہ عالم تھا کہ مکہ میں مہینوں میں چند لوگ ہی ایمان لائے ہوں گے اور اب یہ منظر ہے کہ ہزاروں افراد کا نمائندہ وفد دفعتاً آیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا' یا بالفاظ دیگر اطاعت تسلیم کر لی۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اس اجتماعی فیصلے کے نتیجے میں ان کے دلوں کی کیفیت بھی چشم زدن میں بدل گئی ہو۔ لہٰذا اب ایسے لوگ بھی وجود میں آ گئے جو مسلم تو ہیں' جنہوں نے اطاعت قبول کر لی ہے' جو کلمۂ شہادت ادا کر رہے ہیں' لیکن "مؤمن" ہونے کی کیفیت ابھی انہیں حاصل نہیں ہوئی۔

یہ بات پیش نظر رکھئے کہ جتنے قبائل بھی ایمان لائے ان میں سب کی کیفیت یہ نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی تھے جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اعراب یعنی بدوؤں کے بارے میں سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۹۹ میں یہ وضاحت موجود ہے :

﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

"اور بدوؤں' بادیہ نشینوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور یوم آخر پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اور رسول (ﷺ) سے دعائیں لینے کا ذریعہ بنانے کے لئے۔ یاد رکھو' ان کا خرچ کرنا بے شک موجب قربت ہے۔ اللہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ بے شک اللہ نہایت مغفرت فرمانے والا' بڑا رحم فرمانے والا ہے"۔

یہ آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سب بدو ایسے نہیں تھے۔

تاویلِ عام کے اعتبار سے ہمارے لئے نوید جاں فزا

اب ذرا اس آیت مبارکہ پر تاویلِ عام کے اعتبار سے غور کیجئے۔ اب اگر ہم اپنی صورتِ حال پر غور کریں گے تو ہمیں محسوس ہو گا کہ ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہم نے اپنے انتخاب (choice) سے تو ایمان قبول نہیں کیا' ہمیں دولت ایمان سوچ سمجھ کر' اپنے فیصلے سے حاصل نہیں ہوئی' بلکہ ہمیں تو اسلام وراثتاً ملا ہے۔ وہاں فتح مکہ کے بعد ایک رو چلی تھی کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں ایک نسلی تسلسل ہے' ایک سلسلہ ہے جو نسل کی وجہ سے منتقل ہو رہا ہے۔ تو ہم میں سے بھی اکثر و بیشتر درحقیقت اس آیت کا مصداق ہیں۔ اِلاَّ مَاشَاءَ اللّٰهُ' جن کو اللہ تعالیٰ حقیقی و قلبی ایمان و ایقان کی دولت نصیب فرما دے۔ اور بہرحال ایسے افراد ہر دور میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں' لیکن اگر ہم اکثریت کو سامنے رکھ کر غور کریں گے تو معاملہ اسی مقام پر نظر آئے گا کہ اسلام ہے' کلمۂ شہادت ہے' لیکن دلی یقین والی کیفیت شاذ و نادر ہی نظر آئے گی ـــــ وہ یقین جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہ یقین عنقا ہے۔ یہ وہ شے ہے جو شاذ شاذ ہی نظر آتی ہے۔

اب اگر ہم اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اس آیت پر مزید غور کریں تو ایک بات ہمارے لئے بڑی امید افزا اور نوید جاں فزا ہے کہ جیسے ان بدوؤں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے سینوں میں جھانکو اور تمہیں محسوس ہو کہ وہ یقین والی بات حاصل نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو ـــــ "اگر تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت پر کاربند رہو گے تو ہم تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کریں گے"۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی رعایت ہے۔ غور کیجئے کہ اگر منطقی اور اصولی طور پر بات سمجھی جائے تو وہ یہ ہو گی کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہونا چاہئے' لیکن یہاں رعایت دی جا رہی ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کو ٹٹولے اور محسوس کرے کہ یقین والی کیفیت موجود نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو۔ اس حالت و کیفیت میں بھی اگر تم اطاعت پر کاربند رہو گے' نافرمانیوں سے بچو گے تو ہم تمہارے اعمال قبول کر لیں گے۔ ان میں کوئی کمی اور کٹوتی نہیں کریں گے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ آیت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی کن صفات پر ہو رہا ہے! فرمایا :
﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ "یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے"۔ یہ اس کی شانِ غفاری کا صدقہ اور اس کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے کہ وہ تمہارے ساتھ یہ نرمی برت رہا ہے اور تمہیں یہ رعایت دے رہا ہے کہ ایمانِ حقیقی اور یقین قلبی میسر نہ ہو تب بھی اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال قبول کر لئے جائیں گے' تمہارے اجر و ثواب میں ذرہ برابر کوئی کمی اور کٹوتی نہیں ہو گی : ﴿لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

جزوی اطاعت کی حقیقت

البتہ اس میں ایک اشتباہ بھی ہے کہ اسے کہیں انسان اپنے لئے ایک کھلا لائسنس نہ سمجھ لے' کھلی چھٹی نہ سمجھ بیٹھے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ حقیقی ایمان کے حصول کی کوئی کوشش ہی نہ کرے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن مغفرت کے لئے کُلی اطاعت مطلوب ہو گی۔ جزوی اطاعت' اطاعت نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعض احکام کو مان لینا اور بعض احکام کو ترک کر دینا' بعض کو سر آنکھوں پر رکھنا اور بعض کو پاؤں تلے روند دینا' یہ اطاعت نہیں ہے۔ یہ جسارت ہے' یہ ڈھٹائی ہے' یہ گستاخی ہے' یہ اللہ کے ساتھ تمسخر و استہزاء ہے۔ وہ جو کہتے ہیں "بازی بازی باریش بابا ہم بازی!" یہ کھیل تم اللہ کے ساتھ کھیل رہے ہو! یہ مذاق تم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کر رہے ہو! نماز پڑھنے کا حکم کس کا ہے؟ اللہ کا! وہ تو ہم پڑھیں گے۔ اللہ ہی کا حکم ہے روزہ رکھو' ہم رکھیں گے' اللہ ہی کا حکم ہے کہ رشوت نہ لو' لیکن اُسے ہم نہیں مانیں گے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اللہ کے بعض احکام کو تو سر آنکھوں پر رکھا اور بعض کو پاؤں تلے روند دیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ جسارت ہے' ڈھٹائی ہے' اللہ کے جناب میں بہت بڑی گستاخی ہے۔ اس پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں شدید تنبیہ کی گئی ہے۔ فرمایا :
﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ "کیا تم ہماری کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟" ـــــ سود کی حرمت بھی تو اسی قرآن میں ہے۔ رشوت لینے اور دینے سے منع بھی تو اسی شریعت اسلامی نے کیا ہے جس میں فرض عبادات کا حکم ہے ـــــ یہ رویّہ اور وطیرہ اختیار کرنے والوں کے لئے آگے وعید

آئی ہے : ﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ "پس کوئی سزا نہیں ہے اس شخص کی جو تم میں سے یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا سوائے اس کے کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے" ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ "اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا' اور جان لو کہ اللہ غافل اور بے خبر نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو"۔ تم لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو' تم لوگوں کی زبانیں بند کر سکتے ہو لیکن اللہ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تو یہ ہے نہایت زوردار انتباہ۔ کسی وقت کوئی خطا ہو جائے تو وہ بات اور ہے —— جذبات میں مغلوب ہو کر انسان کوئی غلطی کر بیٹھے تو یہ بات اور ہے۔ وہ فوراً رجوع کرے گا' توبہ کرے گا۔ توبہ پر ہماری ان مجالس میں بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ راہ چلتے ہوئے کہیں پھسل کر کیچڑ میں گر جائیں تو وہاں پڑے نہیں رہتے' بجلی کی تیزی سے اٹھتے ہیں۔ یہی معاملہ توبہ کا ہے۔ انسان کا پاؤں پھسل سکتا ہے' لغزش ہو سکتی ہے' انسان کسی معصیت میں' کسی گناہ میں' کسی غلط کام میں ملوث ہو سکتا ہے۔ ماحول کے کچھ وقتی اثرات غالب آ جائیں' کسی وقت نفس میں کوئی طوفان آ گیا ہو جس کے باعث آپ کے حواس مختل ہو جائیں' آپ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو جائیں اور آپ کوئی غلط کام کر بیٹھیں' تو اگر اللہ کا خوف دامن گیر ہے' خدا ترسی ہے' آخرت کا استحضار ہے تو آپ ہوش میں آتے ہی رجوع کریں گے' پلٹیں گے' ندامت اور پشیمانی کا اظہار کریں گے۔ آپ اپنی خطا کا اللہ کے سامنے اقرار کریں گے' سچے دل سے توبہ کریں گے' گڑگڑا کر اس سے استغفار کریں گے' اس سے عفو کے طالب ہوں گے۔

آپ کی اس روش کے جواب میں آپ کے ساتھ معاملہ یہ ہو گا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

وقتی طور پر خطا کا صدور ہو جانا' کوئی گناہ کر بیٹھنا' کسی معصیت کا ارتکاب ہو جانا بالکل دوسری بات ہے' لیکن کسی معصیت پر مستقل ڈیرہ لگا کر بیٹھ جانا' اپنی زندگی میں کسی حرام کام کو مستقل طور پر جاری رکھنا' یہ بالکل وہی بات ہے کہ : ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ

الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ ـــــ اس وطیرے اور رویئے پر جو وعید آئی ہے اس کے تناظر میں آپ نے محسوس کرلیا ہو گا کہ ہم جو یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

یعنی ہم دنیا میں کیوں ذلیل و رسوا ہو گئے اور اس ذلت و رسوائی میں اضافہ کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے؟ تو اس کا جواب سورۃ البقرۃ کی اسی آیت میں موجود ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ہم نے شریعت اسلامی کے حصے بخرے کر رکھے ہیں کہ ایک کو مانیں گے' ایک کو نہیں مانیں گے۔ اسی گستاخانہ رویئے کی سزا بیان ہوئی : ﴿خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ "دنیا کی زندگی میں رسوائی' ذلت اور خواری"۔ یہی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے اور اسی رویئے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آخرت کے عذاب کا مستحق بنا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری و رحیمی کے سہارے اگر چھٹکارا مل جائے تو بات دوسری ہے۔

اسلامی معاشرے میں "ایمان" اور "اسلام" کی اہمیت

اس آیت مبارکہ کے بارے میں اب آخری بات نوٹ کیجئے۔ اپنی جگہ پر اس کا یہ مضمون بہت اہم ہے کہ اس میں اسلام اور ایمان کو علیحدہ کر دیا گیا ـــــ اور اس مضمون کے اعتبار سے یہ آیت قرآن مجید کی چوٹی (Climax) اور ذروۃ السنام ہے ـــــ اب سوال یہ ہے کہ سورۃ الحجرات میں مسلمانوں کی حیات ملی کے جو مضامین آرہے ہیں' ان سے اس بحث کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ ہر سورۃ کا جو مرکزی مضمون ہوتا ہے اس سورۃ کی تمام آیات اس کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں ـــــ وہ ربط یہ ہے کہ چاہے مسلمانوں کے معاشرے میں شمولیت و شرکت کا معاملہ ہو' چاہے اسلامی ریاست کی شہریت کا معاملہ ہو' ان دونوں کی بنیاد اسلام ہے' ایمان نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تو قانونی معاملہ ہے۔ ایک مسلمان مرد کی شادی ایک مسلمان عورت سے ہو سکتی ہے اور ایک مسلمان عورت کا نکاح صرف ایک مسلمان مرد سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان باپ کی وراثت مسلمان اولاد ہی کو منتقل ہو سکتی ہے۔ یہ خالص قانونی مسئلہ ہے۔ اسلامی ریاست کا شہری مسلمان ہو گا۔ اسلام اس شہریت کی بنیاد ہے۔ لہٰذا طے کرنا پڑے گا کہ کون مسلمان ہے' کون نہیں ہے۔ جبکہ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو وہ ایک باطنی کیفیت ہے' وہ دل میں ہوتا ہے۔ دل میں

یقین ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ آج بھی ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ اور ذریعہ موجود نہیں ہے جس کی مدد سے ہم یہ طے کر سکیں کہ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں ہے۔ لہٰذا دنیا میں مسلمان معاشرے میں کسی کی شرکت و شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد اسلام ہے' ایمان نہیں ہے۔ البتہ آخرت میں ہمارا جو انجام ہوتا ہے اس کی بنیاد ایمان ہے۔

"ایمان" کی جامع و مانع تعریف

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کے خصائص کیا ہیں! —— یہ اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت کا موضوع ہے' جس کا اب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ ﴾

"مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر' پھر شک میں نہیں پڑے' اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ صرف یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔"

یہ آیت مبارکہ بھی اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ مضمون یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کی تعریف کیا ہے؟ جب یہ واضح ہو گیا کہ ایمان اور ہے' اسلام اور ہے تو فطری طور پر ایک سوال ذہن میں ابھر کر آئے گا کہ "ایمان" کسے کہتے ہیں! چنانچہ یہ وہ مقام ہے جسے میں ایمان کی جامع و مانع تعریف قرار دیتا ہوں۔ جامع و مانع تعریف ایک تو اس پہلو سے ہے کہ سیاقِ کلام میں ایمان اور اسلام کا علیحدہ علیحدہ بیان ہوا ہے۔ ویسے ایمان کی کیفیات قرآن مجید میں جابجا بیان ہوئی ہیں۔ ایمان کے ثمرات اور اس کے نتائج کے بارے میں ہم سورۃ التغابن میں تفاصیل پڑھ چکے ہیں' جس کا دوسرا رکوع ایمان کے ثمرات' ایمان کے نتائج' ایمان کے مقتضیات اور ایمان کے مضمرات ہی کے موضوع پر تھا۔ لیکن یہاں یہ دیکھنا ہے کہ سیاقِ کلام کیا ہے! وہ ہے ایمان اور اسلام کا فرق۔ لہٰذا اس پس منظر میں یہ مضمون آ رہا ہے کہ مؤمن تو بس وہ ہیں جن میں وہ دو شرطیں پوری ہوں جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہو رہی ہیں —— گویا یہ ایمان کی تعریف (definition) کا مقام ہے —— دوسرے اس پہلو سے کہ اس آیت مبارکہ

کے شروع میں بھی اسلوبِ حصر ہے اور اختتام پر بھی۔ "حصر" ایک اصطلاح ہے' اس کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکے گا کہ ہم ایک جملہ کہتے ہیں "زید عالم ہے" اور ایک کہتے ہیں کہ "زید ہی عالم ہے"۔ اب غور کیجئے کہ ان دو جملوں میں کیا فرق واقع ہوا؟ پہلے جملے "زید عالم ہے" میں زید کے عالم ہونے کا اثبات ہوا لیکن کسی دوسرے کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ یعنی زید کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس جملے میں کہ "زید ہی عالم ہے" زید کے عالم ہونے کا اثبات اور دوسروں کے عالم ہونے کی نفی ہو رہی ہے۔ یعنی زید کے سوا اور کوئی عالم نہیں ہے۔ گویا علم منحصر ہے زید میں۔ اس کو اسلوبِ حصر کہتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے شروع میں آیا : ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ...﴾ معنی ہوں گے "مومن تو بس وہ لوگ ہیں" یا "مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں"۔ آخر میں بھی اسلوبِ حصر ہے : ﴿اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝﴾ "صرف یہی لوگ سچے ہیں"۔ یعنی دعوائے ایمان تو انہوں نے بھی کیا تھا جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا﴾ ایمان کے مدعی اور دعوے دار تو بہت سے ہیں' لیکن اس دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ ہیں جو ان شرطوں کو پورا کریں جو اس آیت مبارکہ میں بیان کی جارہی ہیں۔

ایمان اور جہاد کا تعلق

آیت کے اس اوّل و آخر کو سمجھ کر اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس آیت کا اصل مضمون اور اصل content کیا ہے! ـــــ آیت پر تھوڑے سے غور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو لوازم ہیں۔ یا اگر بغرضِ تفہیم فقہی اصطلاح استعمال کی جائے تو کہا جائے گا کہ ایمانِ حقیقی کے دو ارکان ہیں۔ دیکھئے کہ ارکان اسلام سے ہر مسلمان واقف ہے جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں :((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (بخاری و مسلم) "اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' حج اور صومِ رمضان"۔ یہ پانچوں کیا ہیں؟ یہ ارکانِ اسلام ہیں؟ اسلام کے ستون ہیں! ـــــ اس اصطلاح کو ذہن نشین کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس آیت مبارکہ کی رو سے ایمان کے دو ارکان کیا ہیں! پہلا رکن ہے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر وہ ایمان جس میں شکوک و شبہات باقی نہ رہیں۔ یہاں بھی دیکھئے کہ "ریب" سے فعل مضارع

"یَرْتَابُوْا" سے پہلے "لَمْ" آیا۔ معنی ہوئے "ہرگز شک نہ کریں"۔ یعنی شکوک و شبہات کے کانٹے بالکل نکل چکے ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہے "یقین قلبی" ـــــ یہ فکر و نظریعنی عقیدے کا اخلاص ہوا۔ یہ ہے ایمانِ حقیقی کا پہلا رکن۔ دوسرا رکن عمل سے متعلق ہے اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ' اپنے اموال اور اپنی جانوں سے۔ پس ایمانِ حقیقی کے دو ارکان ہوئے' ایک "یقین" جو قلب میں ہو گا اور دوسرا "جہاد" جو عمل میں ہو گا۔

یہاں ایک نکتہ مزید سمجھ لیجئے۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ ہیں: اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ۔ ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دو پہلو یا دو درجے ہیں۔ ایک زبان سے اقرار اور دوسرا دل سے تصدیق یا قلبی یقین۔ اب ان میں سے پہلا درجہ یعنی اِقْرَارٌ باللسانِ ایمانِ قانونی یا اسلام کا رکن ہے ـــــ شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ یہ تصدیق ہے' testimony ہے۔ ایک شخص زبان سے اقرار کرے کہ میں مانتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تسلیم کرے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' تو اس اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ کی حیثیت اسلام کے رکن کی ہو گی جبکہ تصدیق بالقلب ایمانِ حقیقی کا رکن ہو گا۔

ایمانِ حقیقی کے دو ارکان میں سے پہلے رکن یعنی یقین قلبی پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے کہ اس کے کیا آثار ہیں! یقین موجود ہے تو اس کے کیا نتائج و ثمرات انسان کے عمل میں ظہور پذیر ہوں گے! ان امور کا ہم سورۃ التغابن میں تفصیل سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں گفتگو کو زیادہ مرتکز کرنا ہو گا دوسرے رکن یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ رکن ہے ایمانِ حقیقی کا' یعنی اگر یہ موجود ہے تو حقیقی ایمان موجود ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو ایمانِ حقیقی حاصل نہیں ہے۔

"جہاد فی سبیل اللہ" کی اصل حقیقت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کیا؟ جہاد کے بارے میں ہمارے یہاں دو بڑے بڑے مغالطے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد کے معنی جنگ کے لئے جاتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے' اس کی بلند ترین چوٹی جنگ ہے۔ اس کی وضاحت آگے بیان کی جائے گی۔ ویسے جنگ کے لئے قرآن مجید کی اصطلاح قتال فی سبیل اللّٰہ ہے ـــــ "جہاد" کا

لفظ "جہد" سے بنا ہے' اور جہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ جدوجہد کا لفظ ہم بولتے ہیں۔ "قتال" کا لفظ "قتل" سے بنا ہے' اس کے معنی جنگ کے ہیں۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مسلمان جو بھی جنگ کرے' جہاد ہے۔ یہ گویا بنائے فاسد علی الفاسد ہے' یعنی ایک غلط بات پر ایک اور غلط بات کی بنیاد رکھ دینا۔ مسلمان کی صرف وہ جنگ قتال فی سبیل اللہ یا جہاد کی چوٹی کے اعتبار سے جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتی ہے جس کا مقصد صرف اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنا ہو۔ اگر وہ ہوسِ ملک گیری کی غرض سے ہے' اپنے دنیوی اقتدار کی توسیع کے مقصد کے تحت ہے تو وہ قتال یا جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں مغالطوں کو ذہن سے نکال دیجئے اور اب مثبت طور پر سمجھئے کہ جہاد کسے کہتے ہیں!

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا مادہ (root) جہد ہے' اور جہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اسے یوں ادا کریں گے "to strive for something"۔ یہ جُہد ہے ـــــ لیکن مجاہدہ یا جہاد کے الفاظ میں ایک اضافی معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجاہدہ وہ ہو گا جہاں جہد' جہد سے ٹکرائے' جہاں کوشش کا کوشش سے مقابلہ ہو۔ عربی زبان میں بابِ مفاعلہ میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں اکثر الفاظ میں آپ کو یہ خاصیت ملے گی کہ دو فریق بالمقابل آ کر ایک ہی عمل کر رہے ہوں اور ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے ہوں۔ جیسے مباحثہ ہے۔ مباحثہ میں دو فریق ہوتے ہیں' اس کا ایک موقف ہے' دوسرے کا کوئی دوسرا موقف ہے۔ یہ اپنے حق میں دلیل دے گا' وہ اپنے حق میں دلیل دے گا۔ یہ اُس کی دلیل کو کاٹے گا' وہ اِس کی دلیل کو کاٹے گا۔ یہ مباحثہ ہے۔ اسی طرح مقابلہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ مقاتلہ یا قتال کے معنی ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ جہاد یا مجاہدہ یہ ہے کہ جہد' جہد سے ٹکرا رہی ہو' کوششوں کا تصادم ہو رہا ہو۔ فارسی میں اس کو کشمکش اور کشاکش سے تعبیر کریں گے۔ انگریزی میں اس کے لئے struggle بالکل صحیح لفظ ہے۔ struggle یقیناً کسی resistance کے خلاف ہوتی ہے' کسی مزاحمت کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ اسی لئے اس کے بعد صلہ یعنی preposition کے طور پر against آتا ہے۔

اب دیکھئے' دنیا میں کیا ہوتا ہے! ایک شخص کا ایک نظریہ ہے' دوسرے کا دوسرا۔ مثال کے طور پر ایک شخص مارکسسٹ ہے' دوسرا شخص مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے۔ یہ بھی اخلاص کے ساتھ اپنے نظریئے کا قائل ہے اور وہ بھی اپنے

نظریئے میں مخلص ہے۔ ان دونوں کے درمیان تصادم ہو کر رہے گا۔ یہ تصادم پہلے نظریاتی سطح پر ہوگا۔ وہ اپنے نظریئے کی تشہیر کرے گا' یہ اپنے نظریئے کو پھیلائے گا۔ وہ اپنے ہم خیال لوگوں کی جماعت بنائے گا' یہ اپنے ہم خیالوں کی تنظیم بنائے گا۔ پھران کے درمیان کشکش ہوگی۔ جو جیت جائے گا' اس کے نظریہ کے مطابق اس ملک میں نظام قائم ہو جائے گا۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ کسی نظریہ کو تسلیم کیا گیا ہو تو اس کے لئے جدوجہد اور مجاہدہ ناگزیر ہے۔ اگر نہیں ہو رہا ہے تو یہ قطعی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص اپنے نظریئے میں مخلص نہیں ہے۔ مخلص اور صاحب کردار انسان ہوگا تو وہ اپنے نظریئے کی دعوت و تبلیغ کے لئے جدوجہد کرے گا اور اسی عمل کا نام جہاد ہے۔ پس اگر کسی شخص کو یقین حاصل ہے اللہ پر' اس کی توحید پر' اس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر' قرآن پر اور اسلام پر تو لامحالہ اس کے اس یقین کا ظہور اس کے عمل میں اس طریق سے ہوگا کہ وہ اسلام کے لئے جدوجہد کرے گا' محنت کرے گا' کوشش کرے گا۔ اسلام کو پھیلائے گا' ایمان کی دعوت عام کرے گا' ان لوگوں کو جمع کرے گا جو اسلام کے لئے جان اور مال دینے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے struggle کرے گا۔ اگر ایمانِ حقیقی دل میں ہے تو یہ ہو کر رہے گا اور اگر یہ نہیں ہو رہا ہے تو دلی یقین والا ایمان موجود نہیں ہے۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ جہاد رُکن ہے ایمان کا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے مراتب و مراحل

اب ذرا جہاد کے مراتب اور درجات کو بھی سمجھ لیجئے۔ اس کے لئے ایک تین منزلہ عمارت کو ذہن میں رکھئے۔ اس کا پہلا اور اہم ترین درجہ مجاہدہ مع النفس ہے۔ آپ نے اللہ کو مانا ہے' رسول ﷺ کو مانا ہے' قرآن کو مانا ہے' شریعت کو مانا ہے' لیکن آپ کا نفس آپ کو کسی اور طرف لے جانا چاہ رہا ہے ـــــ شریعت نے کہا ہے کہ سود حرام ہے' مگر نفس آپ کو ترغیب دے رہا ہے کہ نہیں یہ تو کاروبار کو پھیلانے کے لئے' معاشی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لئے ناگزیر ہے' اس کے بغیر کاروبار محدود رہے گا اور اس کی توسیع ممکن نہیں ہوگی' نتیجتاً میں معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤں گا۔ اب یہ کشمکش آپ کے باطن میں پیدا ہوگی۔ اسی طرح صبح کا وقت ہے' اذان بھی ہوگئی ہے' آپ نے سن بھی لی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگیا ہے کہ اس وقت حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کی صدا' یہ

پکار' یہ call اللہ کی طرف سے ہے' لہٰذا اب مسجد کا رخ کرنا اور نماز پڑھنا ہے۔ لیکن نفس کہتا ہے کہ نہیں' ابھی سوتے رہو' ابھی آرام کرو' کیوں صبح کی میٹھی نیند کو خراب کرتے ہو! تو اس نوع کی کشمکش ہر شخص کے اندر ہر آن' ہر وقت ہوتی رہتی ہے' اسے ہر لحظہ ایسی کشمکش سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس میں اگر آپ اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کریں' اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع بنائیں' تو یہ مجاہدہ مع النفس ہے' یہ اپنے اندر کا جہاد ہے۔ اسے نبی اکرم ﷺ نے افضل جہاد قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) سوال یہ تھا کہ "اے اللہ کے رسول ﷺ سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ تو اپنے نفس سے کشمکش کرے اور اسے اللہ کا مطیع بنائے"۔ بدقسمتی سے جہاد کا یہ تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

اندر کی شخصیت سے پھر یہ جہاد باہر نکلے گا تو اب ہو گا "مجاہدہ مع الکفر" ـــــ یعنی نظریاتی سطح پر آپ ایمان کی دعوت دیجئے۔ کفر' الحاد' مادہ پرستی اور اباحیت کے خلاف تبلیغ' تلقین اور وعظ و نصیحت کیجئے اور دلائل و براہین پیش کیجئے۔ نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی دعوت اور فروغ کا کام کیجئے۔ ظاہر بات ہے کہ ان کاموں میں مال بھی کھپے گا' جان بھی کھپے گی اور وقت بھی لگے گا۔ اسی وقت کو صرف کر کے آپ پیسہ کما سکتے ہیں' لیکن یہ وقت آپ کو دعوت و تبلیغ میں لگانا ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ہوئی ـــــ پہلی مجاہدہ مع النفس اور دوسری مجاہدہ مع الکفر۔

تیسری منزل ہے "مجاہدہ مع الکفّار" ـــــ بات اب اگر آگے بڑھے گی تو کشمکش ہو گی۔ کفار اپنے نظریے کا غلبہ چاہتے ہیں اور مؤمن دین کا غلبہ چاہتا ہے! لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ ان کے مابین پُر امن مفاہمت ناممکن ہے' لہٰذا تصادم ہو کر رہے گا۔ لیکن اس تصادم کے بھی مختلف مراحل ہوں گے۔ اس تصادم کا ابتدائی مرحلہ ہو گا صبر محض' جسے انگریزی میں Passive Resistance کہتے ہیں۔ مخالفین آپ پر تشدد کریں' آپ کو ستائیں' لیکن آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں' پیچھے نہ ہٹیں اور پھر جوابا ہاتھ بھی نہ اٹھائیں۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو چکی ہو کہ آپ جوابی کارروائی بھی کر سکیں تو اس کو Active Resistance کہیں گے۔ اب آپ بھی

اقدام کریں۔ دیکھئے مکہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کیا حکم تھا! یہ کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے' لیٹ جاؤ۔ تم جوابی اقدام نہیں کر سکتے' اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ہاتھ کھول دیئے گئے۔ آیت نازل ہو گئی : ﴿ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّھُمۡ ظُلِمُوۡا ﴾ یعنی آج سے اجازت دی جا رہی ہے ان کو جن پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے تھے کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور اس تصادم مع الکفار کا آخری درجہ ہے Armed Conflict یعنی مسلح تصادم۔ اور یہ ہے جہاد کی وہ بلند ترین چوٹی' جہاں پہنچ کر جہاد قتال بن جائے گا' جس کے بارے میں الفاظ آئے : ﴿ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ ﴾ مدینہ منورہ میں وہ وقت آیا کہ حکم آ گیا کہ اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے۔

پس یہ جہاد فی سبیل اللہ کے تین مراحل ہیں۔ اس کی غرض و غایت کیا ہو گی؟ اللہ کے دین کا غلبہ' اللہ کے دین کو قائم کرنا۔ وہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے دیا' جو اس کے رسول ﷺ نے دیا' جو قرآن نے دیا اسے بالفعل نافذ کرنا۔ اس کے لئے پہلے مجاہدہ مع النفس ہے۔ یعنی اپنے اندر جو خدا کا دشمن موجود ہے' اسے زیر کرو —— پھر مجاہدہ مع الکفر ہے۔ یعنی نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کرو۔ پھر مجاہدہ مع الکفار ہے' جس میں صبر محض' اقدام اور وقت آنے پر مسلح تصادم کے مراحل ہیں۔

اور یہ جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ کی راہ میں جان دینے کی آرزو رکھنے کو بھی ایمان کا ایک اہم ترین رکن قرار دیا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جنگ ہر وقت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دل میں حقیقی ایمان موجود ہے تو یہ تمنا موجود رہنی چاہئے کہ کاش میری زندگی میں وہ وقت آئے کہ خالصتاً قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آئے اور میں اس میں اپنی گردن کٹا کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں سرخرو اور سبکدوش ہو جاؤں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ)) (صحیح مسلم) "جس شخص کی موت اس حال میں واقع ہوئی کہ نہ تو اس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی آرزو پیدا ہوئی تو اس شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی" —— اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو شوقِ شہادت سے معمور فرمائے۔

جہاد شروع تو مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے لیکن اس کی آخری منزل وہی قتال فی سبیل اللہ ہو گی۔ یہ نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اگرچہ اس کی کچھ شرائط ہیں' وہ پوری ہوں گی تو آپ وہاں پہنچیں گے' لیکن یہ آرزو دل میں رہنا کہ ہماری زندگی میں وہ مرحلہ بھی آئے' ایمان کی شرط لازم ہے۔ اگر یہ نہیں تو ایمان نہیں ہے۔

پس ایمان کے دو رُکن ہیں جو اس آیت مبارکہ کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے۔ اب آپ جمع کر لیجئے۔ جب اسلام اور ایمان دونوں یکجا ہو جائیں گے تو گویا اقرار باللسان بھی ہو گا اور تصدیق بالقلب بھی۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے' جبکہ شک و شبہ سے مبرا ایمان دل میں اور جہاد فی سبیل اللہ بالنفس و بالمال عمل میں' یہ ایمان کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے' اور اس طرح گویا ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت مکمل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس نقشے پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایمان کا راستہ

﴿ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○ ﴾ —— صدق اللہ العظیم

"کہئے: کیا تم اللہ پر جتلانا چاہتے ہو اپنا دین' حالانکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں' اور اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ وہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے۔ کہئے: مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ بجھائی اگر تم فی الواقع سچے ہو۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی ہر چھپی چیز اللہ کے علم میں ہے' اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔

فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں میں زیادہ تعداد اعراب یعنی بدّوؤں کی تھی۔ ان میں سے اکثر کی کیفیت ایک علاقائی محاورے "تھوتھا چنا باجے گھنا" یعنی "خالی برتن زیادہ کھڑکتا ہے" کے مصداق تھی۔ چنانچہ جن کے دل میں ایمان نہیں تھا وہ کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر اپنے ایمان و اسلام کا اظہار کرتے اور آنحضور ﷺ پر احسان جتاتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے تھے اضافی حقوق کا مطالبہ کرتے کہ دیکھئے حضورؐ! نہ تو ہم نے آپ سے جنگ کی' نہ کبھی آپ کی مخالفت کی بلکہ ہم پُرامن طور پر اسلام لے آئے' لہٰذا ہمارا حق دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ ہمیں صدقات میں سے بھی حصہ ملنا چاہئے اور ہماری رعایت زیادہ ہونی چاہئے۔ اس آیت میں انہی زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے والوں کے بارے میں قدرے سرزنش کے انداز میں فرمایا: ﴿ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ﴾ کہ اے نبیؐ! آپ ان سے پوچھئے کہ تم کس کو بتانا چاہتے ہو کہ تم اسلام لے آئے ہو؟ کیا تم اللہ کو اپنے دین و ایمان کی اطلاع دینا چاہتے ہو؟ اسے جتلانا چاہتے ہو کہ تم ایمان لے آئے ہو! ﴿ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ "حالانکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے"۔ اگر تمہارے دل میں ایمان ہے' اگر تم واقعی صاحب ایمان ہو تو کیا کوئی چیز اللہ کی نگاہوں سے پوشیدہ اور اس کے علم سے باہر ہو سکتی ہے! ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ "اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے"۔ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

اصل میں وہ اپنے ایمان کا احسان رسول اللہ ﷺ پر دھرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ﴾ "اے نبی! یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں"۔ چونکہ صدقات کی تقسیم کا معاملہ آپؐ کے ہاتھ میں تھا' لہٰذا اپنے اسلام لانے کا احسان آپؐ پر دھرتے تھے تاکہ صدقات و خیرات میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ مل سکے!

نوٹ کیجئے' یہاں ایمان اور اسلام کو پھر الگ اصطلاحات کی شکل میں لایا جا رہا ہے اور اس اعتبار سے یہ مقام پورے قرآن مجید میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ اسلام اور ایمان کو علیحدہ علیحدہ بھی کیا گیا لیکن اس آیت میں ان دونوں کے ربط کو بڑی خوبصورتی سے واضح بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آیت کے پہلے حصے میں اسلام کا آنحضور ﷺ پر احسان

جتانے کے حوالے سے ان کے طرزِ عمل پر گرفت فرمانے کے بعد کہ : ﴿ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ﴾ "اے نبی یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ اسلام لے آئے' کہہ دیجئے مجھ پر کوئی احسان نہ دھرو اپنے اسلام کا"۔ فرمایا : ﴿ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾ "بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے (اس کا احسان مانو) کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھا دیا ہے اگر تم (اپنے دعوائے اسلام میں) سچے ہو"۔ یعنی ایک تو وہ لوگ تھے جنہوں نے دھوکہ دینے کی نیت سے کلمہ پڑھا' یہاں ان کی بات نہیں ہو رہی' اگر تم نے دھوکے کی نیت کے بغیر اسلام کا کلمہ زبان سے ادا کیا ہے تو گویا کہ اللہ کا احسان مانو کہ تمہیں اللہ اس راستے پر لے آیا ہے کہ جس کی اگلی منزل ایمان ہے۔ اب تم ایمان تک پہنچ سکتے ہو' اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ جو شخص اس سڑک پر آگیا اب گویا کہ اس کے لئے آسان ہے کہ وہ ایمان کی منزل تک رسائی حاصل کر لے۔ "ہدایت" کے مختلف درجات کو ذہن میں رکھئے کہ راہ دکھا دینا بھی ہدایت کا ابتدائی درجہ ہے اور راہ پر لے آنا بھی ہدایت ہی کا اگلا درجہ ہے۔ یہاں دونوں اعتبارات سے ترجمہ کیا جا سکتا ہے : ﴿ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ﴾ "کہ رسولؐ پر اپنے ایمان و اسلام کا احسان دھرنے کی بجائے اللہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ پر ڈال دیا' اگر تم فی الواقع اپنے دعوائے اسلام میں سچے ہو"۔ بقول شاعر ؎

"منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت"

یہاں نوٹ کیجئے کہ پہلے لفظ "اسلام" کے حوالے سے گفتگو ہے : ﴿ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ﴾ اور پھر ﴿ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾ میں ایمان کی راہ پر ڈالنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے احسان کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس طرح "اسلام" اور "ایمان" کو دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے طور پر بیان کر کے ان کے باہمی ربط کو بھی واضح فرما دیا ہے۔

آگے چلئے' فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یہ اس سورۂ مبارکہ کی اختتامی (concluding) آیت ہے۔ "اللہ تعالیٰ تو آسمانوں اور زمین کی ہر

چھپی شے کا جاننے والا ہے"۔ ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ ﴾ "اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔ اس میں ایک طرح کی دھمکی بھی مضمر ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے اعمال کو' تمہارے سارے کرتوت ہماری نگاہ میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلص اہل ایمان کے لئے تسلی کا سامان بھی ہے کہ تمہاری قربانیاں' تمہارا ایثار اور تمہارے اعمالِ صالحہ سب ہماری نگاہ میں ہیں' ہم ان سب سے بے خبر نہیں ہیں۔ جیسا کہ آنحضور ﷺ سے تسلی آمیز انداز میں فرمایا گیا: ﴿ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ "اے نبیؐ' آپ ہماری نگاہوں میں ہیں"۔ اس اعتبار سے ہر صاحب ایمان کے لئے یہ الفاظ گویا کہ ہمت افزائی کا موجب ہیں کہ: ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ لیکن جن کے دلوں میں روگ ہے ان کے لئے یہی الفاظ کلمۂ تہدید کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ دھمکی آمیز الفاظ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان حقیقی سے بہرہ اندوز فرمائے اور اس کے جو اضافی ارکان ہیں' ارکان اسلام پر مستزاد' یعنی یقین قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ' ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

مرکزی **انجمن خُدّامُ القُرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حِکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ